ذُوالحجہ ۱۴۴۶ھ
جون ۲۰۲۵ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- جاہلیتِ جدیدہ کے خلاف جہاد بالقرآن
- حقیقتِ عملِ صالح
- حج کے روحانی ثمرات

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر
کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:

مختصر
بیانُ القرآن
ترجمہ مع منتخب حواشی

❁ امپورٹڈ میٹ پیپر ❁ دیدہ زیب مضبوط جلد ❁ 1248 صفحات

4500/- روپے کے بجائے
صرف 2200/- روپے میں

فری ہوم ڈلیوری کے ساتھ
رمضان پیکج کے تسلسل میں

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org — 0301-1115348

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

’’اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!‘‘

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جلد	:	74
شمارہ	:	6
ذوالحجہ		1446ھ
جون		2025ء
فی شمارہ	:	50روپے
سالانہ زرِتعاون:		500روپے

مُدیر مسئول
شجاع الدین شیخ

مُدیر اعزازی
حافظ عاکف سعید

مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

مجلسِ ادارت
○ رضاء الحق ○ ایوب بیگ مرزا
○ خورشید انجم ○ وسیم احمد

معاون مدیران
○ محمد خلیق ○ حافظ محمد زاہد

مکتبہ خدام القرآن لاہور، K-36، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
فون: 3-35869501 (042)، 0341-4941212
ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
publications@tanzeem.org
ویب سائٹ www.tanzeem.org ، www.tanzeemdigitallibrary.com

مرکزی دفتر تنظیمِ اسلامی ’’دارُالاسلام‘‘ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور   طابع: رشید احمد چوہدری   مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ______ 5
سفید جھنڈے اور کالے جھنڈے!
رضاء الحق

درسِ قرآن ______ 9
سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ (۲)
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ ______ 35
عورت جنسِ تجارت نہیں ہے!
اسرائیل نواز کمپنیوں سے معاہدے؟
شجاع الدین شیخ

دعوتِ فکر ______ 40
.......ہاں باقی وہ رہ جائے گا!
ایوب بیگ مرزا

ہماری دعوت ______ 45
جاہلیتِ جدیدہ کے خلاف جہاد بالقرآن
ڈاکٹر انوار علی

تفکّر و تدبّر ______ 55
حقیقتِ عملِ صالح
محمد رشید عمر

ارکانِ اسلام ______ 71
حج کے روحانی ثمرات
احمد علی محمودی

انوارِ ہدایت ______ 79
علالت اور عیادت
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

’’ادارہ‘‘ کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سفید جھنڈے اور کالے جھنڈے!

گزشتہ دنوں تقریباً تمام بڑے اخبارات نے ایک شہ سرخی لگائی کہ وزیر اعظم پاکستان نے کہا ہے کہ ’’بھارت سے ۱۹۷۱ء کی جنگ کا بدلہ لے لیا ہے۔‘‘ اس میں شک نہیں ہے کہ بھارت کے آپریشن ’’سندور‘‘ کے مقابلے میں پاکستان کے آپریشن ’’بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ‘‘ کو کامیابی ملی۔ اس کے نتیجے میں کوئی فیلڈ مارشل قرار پایا تو کسی کو چیف برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پہلے اس امر میں اختلاف تھا کہ پاکستان نے بھارت کے پانچ رافیل طیارے گرائے ہیں یا تین‘ پھر جب تحقیقات ہوئیں تو معلوم ہوا کہ پانچ نہیں چھ طیارے مار گرائے گئے تھے۔

پاکستان کی اِس کامیابی سے شاید ہی کوئی محبِ وطن انکار کرے‘ مگر اس کامیابی کو ۱۹۷۱ء کی جنگ کا بدلہ قرار دینا ہرگز درست نہیں۔ آج کی نوجوان نسل بلکہ وہ نسل بھی جو گزشتہ پانچ سات سال سے عملی زندگی میں قدم رکھ چکی ہے‘ کو تو شاید یہ بھی علم نہیں ہے کہ بنگلہ دیش ۱۹۷۱ء سے پہلے مشرقی پاکستان ہوا کرتا تھا۔ تاہم اچھی بات یہ ہے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے ابھی زندہ ہیں اور ہر سال ۱۶ دسمبر کا دن اُنہیں اُداس کر جاتا ہے۔ اِس صدی کے آغاز میں پاکستان کے عنانِ اقتدار پر فائز فوجی حکمران کی پالیسیوں کی بدولت قوم کے اذہان سے یہ صدمہ تقریباً محو کرا ہی دیا گیا تھا کہ دس سال پہلے اسی تاریخ کو پشاور میں سانحہ اے پی ایس سے قوم کا غم دو آتشہ ہو گیا تھا۔ بے شک نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد ۱۰ مئی ۲۰۲۵ء کو پہلی مرتبہ اِس قوم کو عزت کا سانس لینے کو ملا ہے۔ وزیر اعظم کے اس بیان سے پاکستان کے عوام کو بڑی خوشی ملی ہے‘ جنہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اُس جنگ میں ہم نے آدھا پاکستان کھو دیا تھا اور مطالعہ پاکستان کی کتابوں کے مطابق ۹۰ ہزار فوجیوں کو جنگی قیدی بنا لیا گیا تھا۔ چونکہ بھاگتے چور کی لنگوٹی بھی کافی ہوتی ہے اِس لیے ہم یہ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ بھارت سے ۱۹۷۱ء کی جنگ کا بدلہ لے لیا گیا ہے۔

وزیر اعظم یہ بیان دیتے ہوئے نجانے مشرقی پاکستان کا کھو جانا کیوں بھول گئے؟ ۹۰ ہزار نہ سہی‘ نو ہزار ہی سہی فوجی قیدی کیوں بھول گئے ہیں؟ عزت مآب وزیر اعظم صاحب سے سوال ہے کہ مئی ۲۰۲۵ء کی جنگ میں کیا ہم نے بنگلہ دیش کو مشرقی پاکستان بنا لیا ہے‘ یا بھارت کے دس ہزار

فوجیوں کو قیدی بنا لیا ہے‘ یا پاکستان نے بھارت کے ایک انچ علاقے کو ہی فتح کر کے وہاں اپنا جھنڈا لہرا دیا ہے؟ البتہ چین سے آنے والی خبروں سے یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ چین نے بھارت کی ریاست ارونا چل پردیش کے کچھ حصوں کو اپنی حدود میں شامل کر کے وہاں نہ صرف چینی پرچم لہرا دیا ہے بلکہ اُس علاقے کا نام بھی بدل کر ’’زنان‘‘ رکھ دیا ہے‘ جبکہ بھارت کا دعویٰ ہے کہ ایسا کچھ ہوا ہی نہیں۔ اگر بھارتی دعویٰ کو نظر انداز کرتے ہوئے چینی دعویٰ ہی کو لے کر چلیں تو پھر بھی چینی کامیابی کو اپنی کامیابی خیال کرنا دانش مندی تو نہیں کہا جا سکتا۔ پاکستانی میڈیا اب چند سال پہلے والا میڈیا نہیں رہا ہے‘ مگر عوام تو یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ معلومات بھی اُنہیں مل رہی ہے وہ سچ کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حالیہ پاک بھارت جنگ‘ بھارت کی درخواست پر بند ہوئی ہے‘ جسے پاکستانی قوم اپنی فتح خیال کر رہی ہے۔ ایسے میں ہماری اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ پاکستانی قوم کی خواہشات اور توقعات کی تکمیل کر دے۔ تاہم اِس میں شک نہیں ہے کہ آپریشن سندور بمقابلہ آپریشن بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ میں پاکستان کا مالی وجانی نقصان بھارت کے نقصان کی نسبت بہت کم ہے اور اِس اعتبار سے پاکستان یہ معرکہ جیت چکا ہے۔ بھارت نے پاکستان کے نیلم جہلم منصوبے کو متاثر کیا ہے۔ اس کا یہ اقدام سنگین جنگی جرم شمار ہوتا ہے جس پر خاموشی اختیار کرنا بذاتِ خود ایک بڑا جرم ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ بھارت نے آپریشن سندور اپنے مذموم مقاصد سے زیادہ اسرائیلی مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے شروع کیا تھا کہ پاکستان کو اپنے دفاع کے چکر میں ڈالے رکھو اور اس دوران میں اسرائیل غزہ میں فلسطینیوں کی نسل کشی کا آپریشن مکمل کرتے ہوئے عرب ممالک سے خود کو تسلیم کرنے کی سند بھی حاصل کر لے۔ اِس آپریشن کا وقت بھی وہ رکھا گیا تھا کہ جب صدر ٹرمپ دورۂ مشرقِ وسطیٰ میں مصروف تھے۔

اس حوالے سے بھارت سے کچھ حسابی غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ اُس کے خیال میں اسرائیلی اسلحہ اور اسٹیبلشمنٹ نے مل کر جس طرح سے غزہ کے نہتے فلسطینیوں کا حشر کیا عین اُسی طرح پاکستان میں بھی ممکن تھا۔ اُس کے نزدیک طاقت کا توازن کچھ اس طرح سے تھا:

(۱) دورانِ جنگ بھارت کے کُل وسائل = بھارتی وسائل + اسرائیلی وسائل + امریکی وسائل + پاکستان کے خلاف بھارت کا منفی پراپیگنڈا

(۲) دورانِ جنگ پاکستان کے کُل وسائل = پاکستان کے کُل وسائل (پاکستان کے اندرونی مسائل + مسلم اُمّہ کے مسائل + پاکستان کے پڑوسی ممالک سے خراب تعلقات)

جبکہ اصل صورتِ حال یہ تھی:

دورانِ جنگ پاکستان کے کُل وسائل = پاکستان کے کُل وسائل (پاکستان کے اندرونی مسائل + مسلم اُمّہ کے مسائل + پاکستان کے پڑوسی ممالک سے خراب تعلقات) + نصرتِ الٰہی

بے شک یہ معرکہ پاکستان نے صرف نصرتِ الٰہی کی وجہ سے ہی جیتا ہے۔ پاکستان اِس آپریشن سے قبل بھارت کو مسلسل متنبہ بھی کرتا رہا ہے کہ وہ پاکستان کو نہ چھیڑے کیونکہ پاکستان ایک پُرامن ملک ہے اور پُرامن ہی رہنا چاہتا ہے۔ اگر پاکستان کو چھیڑ ہی دیا گیا تو پھر بھارت کو چھپنے کی جگہ نہیں ملے گی۔ پھر ساری دنیا نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوا۔ جب تک بھارت پاکستان پر حملے کرتا رہا‘ پاکستان دنیا کو بتاتا رہا کہ بھارت زیادتی کر رہا ہے اسے روکا جائے مگر بھارت کو روکنے کے لیے کوئی بھی ملک سامنے نہیں آیا۔ جیسے ہی پاکستان نے جوابی کارروائی کی تو امریکہ اور سعودی عرب سمیت کئی عالمی طاقتیں امن کے جھنڈے لے کر پاکستان کی طرف بڑھنے لگیں اور آخر کار امریکہ ’’بہادر‘‘ کی کوششیں رنگ لے آئیں اور سیز فائر ہو گیا۔

بھارت اور پاکستان کے مابین سیز فائر کوئی پہلی مرتبہ نہیں ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی کم و بیش تین مرتبہ ہو چکا ہے اور ہمیشہ اُس وقت ہوا ہے جبکہ پاکستان اللہ کی مدد سے دشمن کو اُس کے گھر تک چھوڑ کر آنے پر پوری طرح قادر تھا۔ یہ صورتِ حال دیہاتوں میں اکثر دیکھنے میں آتی ہے کہ جب ایک طاقتور کسی کمزور پر حملہ کرتا ہے تو گاؤں کے سارے طاقتور خاموش رہتے ہیں مگر جب کمزور طاقتور کی پٹائی کرنا شروع کرتا ہے تو سارے طاقتور صلح صفائی کے لیے میدان میں آ جاتے ہیں۔ کئی طاقتور تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو صلح صفائی کی غرض سے کمزور کو مکمل طور پر جکڑ لیتے ہیں اور طاقتور اُس کی خوب دھلائی کرتا رہتا ہے اور جب وہ پٹائی کرتے کرتے ہانپنے لگتا ہے تو پھر صلح بھی کرا دی جاتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اِس مرتبہ پاکستان کے ساتھ ایسی صورتِ حال نہیں ہوئی‘ ماضی میں کبھی ہوئی ہو تو الگ بات ہے!

درحقیقت یہ جنگ بندی نہیں بلکہ آپریشن سندور اور آپریشن بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ کے حوالے سے سیز فائر ہوا ہے جو عارضی ہے۔ ذرائع کے مطابق‘ اس کے بعد بھارت نے امریکہ سے مزید فضائی اسلحہ حاصل کیا ہے۔ بے شک رافیل طیاروں کا غم بھلانے سے بھولے گا۔ حقیقت یہی ہے کہ بھارت اس دوران رسمی یا غیر رسمی اور سرکاری یا غیر سرکاری طور پر پاکستان کو نقصان پہنچانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرے گا۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان ہمیشہ سے ہی امن کا خواہاں و خوگر رہا ہے‘ اسی لیے اُس نے کبھی بھی جنگ کا آغاز نہیں کیا۔ دوسری طرف بھارت یہ سمجھتا ہے کہ وہ جنگل کا

شیر ہے اور دنیا بھر کے مسلمان اُس کی رعایا ہیں کہ وہ جس کا چاہے شکار کر لے۔ یہود کا بھی یہی موقف ہے کہ دنیا میں عزّت سے رہنے کا حق صرف ان ہی کو حاصل ہے جبکہ غیر یہودی gentile یعنی انسان نما حیوان ہیں۔ ان کے نزدیک یہ حشرات الارض کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی جان و مال اور عزت کی اہمیت ہی نہیں ہے۔ اسی خیال سے وہ گزشتہ ۷۷ برس سے فلسطینی مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ برس پہلے جب حماس نے ’’تنگ آمد بجنگ آمد‘‘ کے مصداق اسرائیل پر حملہ کیا تو صہیونی یہودیوں کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ سالِ رواں کے آغاز تک حماس نے اسرائیل کا جس قدر نقصان کر دیا تھا‘ دنیا کی کسی بھی بڑی طاقت کو اس کی توقع ہی نہیں تھی۔ پھر دنیا کے طاقتور ممالک کو ہوش آیا اور اُنہوں نے جنگ بندی کرا دی۔ اِس جنگ سے غیر وابستہ اقوام بھی اس جنگ بندی پر خوش تھیں اور توقع کر رہی تھیں کہ اب دنیا میں امن ہو جائے گا مگر چند ہفتوں کے بعد ہی اسرائیل نے عہد شکنی کرتے ہوئے غزہ پر وہ بمباری کی کہ جو اس سے پہلے کبھی بھی نہیں کی تھی۔ اسرائیل کی اس حرکت کو دنیا بھر میں کہیں بھی سراہا نہیں گیا تو کسی بھی طاقت نے اِس کی مذمت بھی نہیں کی۔

بھارت چونکہ اس وقت مکمل طور پر اسرائیلی گود میں ہے اور اُسی کی دی ہوئی تربیت کے مطابق عمل کر رہا ہے تو ہمارا خیال ہے کہ پاکستان نے بھی سیز فائر کرتے ہوئے یقیناً اسرائیل اور اہلِ غزہ کی جنگ بندی کا انجام سامنے رکھا ہی ہوگا۔ ۶ اور ۷ مئی کی درمیانی رات کو میزائل حملوں کے بعد جب پاکستان نے جوابی کارروائی کی تو بھارت نے اپنی کئی سرحدی چوکیوں پر سفید جھنڈے لہرا دیے تھے جن کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ مزید جنگ نہیں کرنا چاہتا۔ پھر جنگ پر اُکسانے والی طاقتوں کے ایما پر وہ اپنے سفید جھنڈوں کو بھول گیا اور اپنی جارحیت کو جاری رکھا۔ اِن حالات میں ہم تو یہی کہیں گے کہ بھارت اور اسرائیل کو تو اپنے سفید جھنڈوں کو بھول جانے کی عادت ہے مگر پاکستان کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اُنہیں کالے جھنڈے لے کر ایلیا کی طرف جانا ہے۔ ایسے میں سیز فائر کے وعدے پر سکون کا سانس لینے یا بھنگڑے ڈالنے کی بجائے رسول اللہ ﷺ کی سُنّت پر عمل کرتے ہوئے اگلے محاذ کے لیے خود کو تیار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اگلا محاذ بلاشبہ المَلحَمۃ الکُبْریٰ ہے جس میں ہمیں امام مہدی کا ساتھ دے کر دجال کو مات دینی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دجال کو پہچاننے اور اُس کا مقابلہ کرنے کی بھرپور ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کا ایمان محفوظ فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ (۲)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ہمارے دین میں سورۂ فاتحہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کے فہم و تدبّر پر کئی اجتماعات ہوجائیں تو بھی یقیناً یہ اس کا حق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کو سمجھانے کا حق ادا کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ جس سورت کی عظمت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہوں کہ اس جیسی سورت نہ تورات میں نازل ہوئی، نہ انجیل میں نازل ہوئی، اور نہ ہی قرآن مجید میں اس کی کوئی مثل، نظیر اور ہم پلّہ کوئی دوسری سورت ہے (حوالہ گزر چکا ہے)، ذرا غور کریں کہ اس سورت کا حق ادا کرنا کس انسان کے بس میں ہے! ہمارے اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر ''اُمّ الکتاب'' کے نام سے لکھی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ وہ معارفِ قرآنی کا بہت بڑا خزانہ ہے، پھر یہ کہ وہ اردو ادب کا بھی بہت بڑا شاہکار ہے، اسے اردو ادب کے classics میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سورۂ مبارکہ کا جیسے حق ادا ہونا چاہیے تھا وہ ادا ہوگیا ہے۔ مَیں حیران ہوں کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیات میں سے ایک آیت کا تو انہوں نے کسی درجہ میں بھی حق ادا نہیں کیا، وہ بڑا مختصر سا پیرا لکھ کر گزر گئے، حالانکہ وہ اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے: ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝﴾۔ اس مرکزی اور بنیادی آیت پر کچھ نہیں لکھا۔ ربوبیت، رحمت، ہدایت، جو سورۂ فاتحہ کے بنیادی مضامین ہیں، اُن پر بڑی مفصّل گفتگو کی ہے اور مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سورۂ فاتحہ کے ان تین مباحث کی تفسیر میں جس مقام تک مولانا ابوالکلام آزاد پہنچ گئے تھے، کسی دوسرے کے لیے وہاں تک پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔

مضامین کا تجزیہ: حدیثِ قدسی کی روشنی میں

اصل میں تجزیہ سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی شے کے یا کسی پیچیدہ بحث کے اجزاء معیّن کرلیں تو اُن کو سمجھ کر یاد رکھنا اور حسبِ ضرورت انہیں ذہن میں تازہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

اس سورہ مبارکہ کے مضامین کا تجزیہ بھی ہمیں ایک حدیثِ قدسی سے ملتا ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابوہریرہ ؓ ہیں، اور شیخین میں سے امام مسلمؒ نے اس کو روایت کیا ہے۔ ان کے علاوہ امام مالک، امام ترمذی، امام ابوداوٗد، امام نسائی اور امام ابن ماجہ رحمھم اللہ نے اس روایت کو اپنی اپنی کتابوں میں لیا ہے۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوجائے گا کہ یہی سورۂ فاتحہ ہماری نماز کا جزو لاینفک اور اس کی اصل روح ہے۔ نیز اس اختلافی مسئلہ کا حل بھی مل جائے گا کہ آیا آیت بسم اللہ اس سورۂ مبارکہ کا جزو ہے یا نہیں!

حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلّٰی صَلَاۃً لَمْ یَقْرَأْ فِیْھَا بِاُمِّ الْقُرْآنِ، فَھِیَ خِدَاجٌ۔ ثَلَاثًا۔ غَیْرُ تَمَامٍ))

''جس نے کوئی بھی نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی تو وہ نماز ناقص ہے، نامکمل ہے۔''

حضرت ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ فَھِیَ خِدَاجٌ حضور ﷺ نے تین مرتبہ دہرایا۔ اس کے بعد حضور ﷺ کے اپنے ہی الفاظ ہیں: غیر تمام یعنی وہ مکمل نماز نہیں ہے۔ گویا لفظ ''خِدَاج'' کی آپ ﷺ نے خود ہی وضاحت فرمادی۔

فَقِیْلَ لِاَبِیْ ھُرَیْرَۃَ: اِنَّا نَکُوْنُ وَرَاءَ الْاِمَامِ حضرت ابوہریرہ ؓ سے سوال کیا گیا کہ ہم تو امام کے پیچھے ہوتے ہیں۔ یعنی امام پڑھ رہا ہوتا ہے تو ہم کیا کریں؟ معلوم ہوا کہ فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ اتنا عملی مسئلہ ہے کہ دورِ صحابہؓ اور دورِ تابعینؒ میں بھی اس مسئلے پر سوالات پیدا ہوگئے تھے۔ فَقَالَ: اِقْرَأْ بِھَا فِیْ نَفْسِکَ ''فرمایا: ایسی صورت میں تم اس کو اپنے دل میں پڑھا کرو''، یعنی آواز ظاہر نہ ہو کہ جماعت متاثر ہو، لیکن امام کے ساتھ ساتھ پڑھا کرو۔ یہ اُن کا اپنا قول ہے، حضور ﷺ کا قول نہیں ہے۔ یہ ان کا اپنا

اجتہاد ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں: اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ : قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : ''مَیں نے خود سنا ہے نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔''

اب یہاں سے حدیثِ قدسی شروع ہو گئی۔ حضور ﷺ بصراحت بیان فرما رہے ہیں کہ یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ((قَسَمْتُ الصَّلَاۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ)) ''مَیں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر لیا ہے۔'' معلوم ہوا کہ اگلی تفصیلات سورۂ فاتحہ کی شرح ہیں۔ پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ سورۂ فاتحہ ہی اصل نماز ہے۔ فرمایا: ((وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ)) ''اور میرے بندے کے لیے ہے جو اُس نے مانگا۔'' اب یہاں حدیث کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حدیث قدسی ختم ہو گئی ہے۔ اب آگے حضور ﷺ مزید وضاحت کے ساتھ اس حدیث قدسی کی شرح فرما رہے ہیں: ((فَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ : اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ)) ''پس جب بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تو اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی۔'' ((وَاِذَا قَالَ: الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ)) ''اور جب بندہ کہتا ہے: الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تو اللہ عزوجل فرماتا ہے: میرے بندے نے میری ثنا کی۔'' ((وَاِذَا قَالَ : مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ قَالَ اللّٰہ تعالیٰ: مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ)) ''اور جب بندہ کہتا ہے: مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تو اللہ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔'' ایک مرتبہ حضور ﷺ نے یہاں یہ الفاظ بدل کر فرمائے کہ ''جب بندہ یہ کہتا ہے: مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا۔'' یعنی مجھے اپنا مالک تسلیم کر لیا' میرے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ہونے کا مطلق اختیار مان لیا۔ ((فَاِذَا قَالَ : اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ قَالَ اللّٰہُ تعالیٰ : ھٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ)) ''پھر جب بندہ کہتا ہے: اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ میرے اور میرے بندے کے مابین ہے' اور مَیں نے اپنے بندے کو دیا جو اُس نے مانگا۔'' ((فَاِذَا قَالَ..... قَالَ ھٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ)) ''پھر جب بندہ کہتا ہے : اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ

الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ)) تو اللہ فرماتا ہے: یہ میرے بندے کا حصہ ہے اور مَیں نے اپنے بندے کو عطا فرمایا جو اُس نے مانگا۔''[11]

اب یہ جو بڑی پیاری وضاحت ہمیں اس حدیث قدسی سے مل گئی' جو صحیحین کے رتبے کی ہے' اس سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ نماز کا اصل جوہر' اصل لُبِّ لُباب' گویا اصل نماز سورۂ فاتحہ ہے۔ دوسری بات یہ بھی معلوم ہو گئی کہ آیت ''بِسْمِ اللّٰہِ'' سورۂ فاتحہ کا جزو نہیں ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ ؒ کی یہ رائے بڑی وزنی ہے' اس لیے کہ اس حدیث میں آیت ''بِسْمِ اللّٰہِ'' کا ذکر نہیں ہے۔ ویسے بھی ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' یہ تکرار ذوقِ سلیم کے مطابق نہیں ہے۔ بہرحال ''بسم اللہ'' ایک علیحدہ آیت ہے اور یہاں اس لیے درج ہے کہ وہ سورۃ التوبہ کے سوا ہر سورت کے شروع میں بطور ایک علامت درج کی جاتی ہے کہ اب ایک نئی سورت شروع ہو رہی ہے۔ اس طرح ثابت ہوا کہ سورۂ فاتحہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے شروع ہوتی ہے۔

تین حصّوں پر مشتمل سورت

ان تمہیدی و اصولی باتوں کو ذہن میں رکھیے تو معلوم ہو گا کہ اس سورۂ مبارکہ کے تین حصے بن جاتے ہیں۔ ایک حصہ جو پہلی تین آیات پر مشتمل ہے وہ کُل کا کُل اللہ کے لیے ہے۔ تمام تر حمد اللہ کی' ثنا اللہ کی' تمجید اللہ کی' تو یہ حصہ کلیتاً اللہ کا ہوا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○﴾

سورت کی آخری تین آیات دعا و درخواست پر مشتمل ہیں:

﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۵ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ○﴾

یہ ہدایت بندہ کی احتیاج ہے' بندہ کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا کہ یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو مجھ سے مانگا مَیں نے اسے دے دیا۔ پہلی تین آیات خالص اللہ کے لیے' آخری تین آیات خالص بندے کے لیے' اب درمیانی آیت وہ مرکزی آیت ہے جو ان دونوں حصوں کو جوڑنے والی ہے:

﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾

اس حدیث پر جب انسان نحوی اصولوں کے مطابق غور کرتا ہے تو جو پہلو سامنے آتے ہیں‘ ان میں سے ہر پہلو انسان کی بصیرتِ باطنی میں اضافہ کرنے والا ہے۔ عجیب بات ہے کہ آیات تین ہیں لیکن گرامر کی رُو سے جملہ ایک ہی ہے‘ اس لیے کہ ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝﴾ کے بعد ﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝﴾ اللہ کی صفات ہیں۔ یہ علیحدہ جملہ نہیں‘ بلکہ اُسی کے ساتھ ملتا ہے۔ ﴿مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝﴾ میں ’’مٰلِکِ‘‘ بھی مجرور ہے۔ اس کے آخری حرف ’’کاف‘‘ پر زیر آرہا ہے‘ یہ بھی اُسی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ تو عربی قواعد کی رو سے پہلی تین آیات ایک ’’جملہ اسمیہ خبریہ‘‘ بنتی ہیں۔ اسی طریقے سے آخری تین آیات بھی ایک ہی ’’جملہ انشائیہ‘‘ بنتی ہیں: ﴿اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝﴾ کے بعد اسی کی صفات اور بدل ہیں: ﴿صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ۝﴾۔

انگریزی میں جملے کا جو analyses کرتے ہیں‘ اس کے اعتبار سے ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝﴾ principal clause اور اگلی دو آیات ﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝﴾ دو subordinate clauses مل کر ایک مکمل جملہ بنتا ہے۔ اسی طرح آخری تین آیات میں اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝ principal clause ہے اور صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ۝ یہ subordinate clauses ہیں اور پھر مل کر جملہ ایک ہی بنتا ہے۔ البتہ درمیانی و مرکزی ایک آیت میں دو جملے ہیں۔ ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ﴾ مکمل جملہ ہے۔ اس میں فعل‘ فاعل اور مفعول تینوں چیزیں بیک وقت موجود ہیں۔ اسی طرح ﴿اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ بھی مکمل جملہ ہے۔ پہلی تین آیات ایک جملہ‘ آخری تین آیات ایک جملہ‘ درمیانی آیت ایک لیکن جملے دو‘ تاکہ تقسیم بالکل برابر ہو جائے۔

آیاتِ فاتحہ: ترازو کی مانند

درمیانی آیت کے دو جملوں کے درمیان واوِ عطف آیا ہے: اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ

نَسۡتَعِیۡنُ ۔ اس کو یوں سمجھ لیجیے‘ جب آپ ترازو کو ہاتھ میں پکڑتے ہیں تو جس حصے کو مٹھی میں لیتے ہیں وہ ہے واوَ۔ واوَ سے پہلے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ اور اس کے ساتھ ابتدائی تین آیات پہلا حصّہ تھا۔ ترازو کے پلڑے میں عموماً ڈوریاں تین ہی ہوتی ہیں۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝ ان تین ڈوریوں سے ایک پلڑا بنا جو اللہ کا ہے اور یہ جڑ گیا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ سے۔ پھر وہ واوَ ہے جہاں سے ترازو ہاتھ میں لیا گیا۔ پھر اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ سے تین ڈوریاں دعا کو جوڑے ہوئے ہیں: اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ۝ تو یہ دوسرا حصّہ بندے کے لیے ہے۔ اس طرح سورۂ فاتحہ کی مکمل تقسیم نصفین میں ہو جاتی ہے۔

حصّہ اوّل (حمد و ربوبیت) کی تفہیم

اس تجزیہ کو ذہن میں رکھ کر ہم پہلے حصے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ فلسفۂ قرآن کے حوالے سے یہ بہت اہم بحث ہے۔[۱۲]

''حمد'' کا معنی و مفہوم

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ ''حمد'' کے معنی کے بارے میں یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ اس کے اندر دو مفہوم ہیں۔ بنیادی مفہوم شکر کا ہے۔ اس شکر کو ہم سورۂ لقمان میں پڑھ چکے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِکۡمَۃَ اَنِ اشۡکُرۡ لِلّٰہِ ؕ وَمَنۡ یَّشۡکُرۡ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ ۚ﴾

''اور ہم نے لقمان کو دانائی عطا فرمائی کہ کر شکر اللہ کا۔ اور جو کوئی شکر کرتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اپنے بھلے کو۔''

شکر منعم کے کسی احسان اور انعام پر ادا کیا جاتا ہے۔ جس نے آپ کے ساتھ بھلائی کی، آپ کی کوئی ضرورت پوری کی، آپ کی کوئی تکلیف دُور کی، تو آپ اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس سے ذرا آگے بڑھ کر ایک ایسی ہستی کا تصور کیجیے جس میں کمالات ہیں، محاسن ہیں، چاہے آپ کو اُن سے کوئی براہِ راست فائدہ نہ پہنچ رہا ہو۔ مثلاً آپ نے ایک پھول دیکھا جو بہت خوبصورت ہے۔ اس کو دیکھنے سے آپ کی کوئی ضرورت تو پوری نہیں ہوئی، لیکن آپ اس کی تعریف کرتے ہیں کہ عمدہ ہے، بہت خوبصورت ہے، اس کی خوشبو بہت اعلیٰ ہے۔ یہ ہے اس کے حسن یا کمال کی تعریف۔ اسی طریقہ سے کسی بہت عمدہ، بہت ہی اعلیٰ منظر کی آپ تعریف کرتے ہیں۔ کسی شخص میں کوئی ایسا وصف پایا جاتا ہے جو محمود ہے، عمدہ ہے، آپ اس کی ثنا کرتے ہیں، تعریف بیان کرتے ہیں، چاہے اُس کے وصف سے آپ کو کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ چنانچہ اگر کسی ہستی سے آپ کو کوئی فیض پہنچا ہے تو آپ شکر کرتے ہیں اور اگر کسی میں کوئی حسن ہے، کوئی کمال ہے، کوئی خیر

ہے، کوئی خوبی ہے، چاہے براہِ راست اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہ پہنچا ہو، تو آپ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ جب آپ شکر اور تعریف کو جمع کر لیں گے تو یہ لفظ حمد بن جائے گا۔ لفظ حمد کا ترجمہ ہمارے ہاں صرف تعریف سے کر دیا جاتا ہے: ''کل تعریف اللہ کے لیے ہے''، لیکن اس سے بات پوری نہیں ہوتی۔ حمد کے لفظ میں شکر اور ثنا دونوں چیزیں جمع ہیں۔

تعریف کا لفظ بھی عربی کا ہے، لیکن عربی میں تعریف کا لفظ اُس معنی میں نہیں بولا جاتا جس معنی میں ہم اُردو میں بولتے ہیں۔ عربی میں تعریف کے لیے لفظِ ثنا ہے، ثنا کے معنی دہرانے اور لوٹانے کے ہیں۔ کسی میں کوئی وصف ہو، آپ نے وہ وصف اُس کے سامنے بیان کیا تو گویا اُس کا وصف اُسی کی طرف لوٹا دیا۔ کسی پھول کی خوبصورتی بیان کی تو اُس کے وصف کو اسی کی طرف لوٹا دیا۔ یہ لوٹانا، دہرانا ہی دراصل ثنا کا مفہوم ہے۔ ثنا یہ ہے کہ کسی کے حسن، کمال، خوبی کو بیان کیا جائے۔ اگر اس میں کوئی نفع، خیر، بھلائی ہو جو آپ کو پہنچی ہو تو اب یہ صرف ثنا نہیں ہو گی بلکہ یہ شکر ہو جائے گا۔ پھر ان دونوں کو جب جمع کریں گے تو یہ لفظ حمد بن جائے گا۔

حمد کا ہمارے دین سے تعلق

لفظِ ''حمد'' کا ہمارے دین سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہماری اس اُمّت کا نام ہی ''حَمَّادون'' آیا ہے، یعنی بہت زیادہ حمد کرنے والے لوگ۔ ہمارے پیارے آقا نبی کریم ﷺ کے نام اسی حمد کے مادہ سے ماخوذ ہیں۔ قرآن مجید میں آپ ﷺ کا نام محمد[۱۳] اور احمد (الصّف:۶) آیا۔ احمد ''حمد'' سے تفضیل کا صیغہ ہے جبکہ محمد ''تحمید'' سے اسم مفعول ہے یعنی جس کی انتہائی حمد کی گئی ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ((اَنَا مُحَمَّدٌ وَاَنَا اَحْمَدُ))[۱۴]۔ آپ ﷺ کے ناموں میں حامد اور محمود بھی ہے۔ گویا آپ ﷺ کے اکثر اسماء گرامی اس لفظ ''حمد'' سے ماخوذ ہیں۔ پھر یہ کہ قیامت کے دن جو مقام آپ ﷺ کو ملنے والا ہے، اس کو قرآن نے ''مقامِ محمود'' کا نام دیا ہے: ﴿عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''کیا عجب ہے (اے نبی ﷺ) آپ کو آپ کا ربّ مقامِ محمود عطا فرما دے۔'' ایک حدیث میں آتا ہے کہ میدانِ حشر کے حوالے سے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بارے میں فرماتے ہیں: ((وَبِيَدِيْ لِوَاءُ الْحَمْدِ))(۱۵) ’’اور اللہ کی حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا۔‘‘ جب میدانِ حشر میں دربارِ خداوندی لگے گا تو اللہ تعالیٰ مجھے اپنی حمد کے الفاظ الہام کرے گا جن سے میں اُس کی حمد کروں گا۔ چونکہ پوری نوعِ انسانیت کے کُل سرسبد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں‘ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی پوری نوعِ انسانی کے سردار ہیں(۱۶)‘ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گویا حاصل انسانیت ہیں‘ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روزِ محشر یہ مقام عطا فرمایا جائے گا۔ مجھے امیر خسرو کا شعر یاد آ گیا ہے۔

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسروؔ
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم!

تشبیہ کے انداز میں امیر خسرو ایک لامکاں کی محفل کا تذکرہ کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میرِ محفل ہوں گے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم شمعِ محفل ہوں گے۔ وہ کیفیت کس درجے میں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت لگی ہوگی اور نوعِ انسانی کھڑی ہوگی۔ اس دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی حمد کرنے والے ہوں گے‘ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اُس روز جو میں اللہ کی حمد کروں گا وہ آج نہیں کر سکتا۔(۱۷) اس لیے کہ اُس وقت عظمتِ خداوندی کے نئے نئے انکشافات ہوں گے‘ تو ظاہر ہے کہ کسی چیز کی حمد انکشافِ حقیقت کی نسبت ہی سے کی جا سکتی ہے کہ جو کسی پر ہوا ہو۔

معرفتِ خداوندی کے ضمن میں ہمیں یہ بات بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی: ((اَلتَّسْبِيْحُ نِصْفُ الْمِيْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ يَمْلَؤُهُ))(۱۸) ’’تسبیح (یعنی کلمہ سبحان اللہ کہنے) سے میزانِ معرفت الٰہی نصف ہو جاتی ہے اور الحمد للہ کا کلمہ کہنے سے پُر ہو جاتی ہے۔‘‘ بعض روایات میں الفاظ آئے ہیں: ((تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ))(۱۹) یعنی زمین و آسمان کے درمیان کا کُل خلا اس کلمہ ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ‘‘ سے پُر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ہے اس لفظِ حمد کی اہمیت۔

حمد سے شرک کی مکمل نفی

قرآن کریم میں مجھے عجیب نظر آیا کہ بالکل ایک جیسے وقفوں کے بعد وہ سورتیں آتی

ہیں جو کلمہ اَلْحَمْدُ سے شروع ہوتی ہیں۔ سورۃ فاتحہ کے بعد ذرا آگے چلیے تو تقریباً چھ سات پاروں کے وقفے کے بعد سورۃ الانعام ملے گی‘ جو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع ہوتی ہے۔ پھر پندرہویں پارے میں سورۃ الکہف ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ①﴾۔ پھر بائیسویں پارے میں دو سورتیں یکجا مل جائیں گی سورۃ سبا اور سورۃ فاطر۔ دونوں کا آغاز کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے ہو رہا ہے۔

غور کیجیے کہ اس سے کس طرح شرک کی جڑ کٹ گئی ہے۔ شرک کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ کسی شے میں کوئی عظمت نظر آئی اور اُس کی عظمت کا اس قدر احساس پیدا ہوا کہ دل خود بخود جھک گیا۔ جب انسان اس حقیقت کو پا لیتا ہے کہ کسی شے میں کوئی عظمت نہیں ہے‘ عظمت کُل کی کُل صرف اللہ کے لیے ہے اَلْعَظْمَةُ لِلّٰهِ‘ کسی شے کا اپنا کوئی حسن ہے ہی نہیں‘ حسن صرف اللہ کا ہے تو وہ شرک سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ مثلاً سورج میں اپنا تو کچھ نہیں ہے‘ کوئی کمال اس کا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ کا ودیعت کردہ ہے۔ اسی طرح چاند میں کوئی شے اپنی نہیں بلکہ اللہ کی پیدا کردہ ہے۔ آگ میں کوئی وصف اپنا نہیں کہ اُسے ’’اگنی دیوی‘‘ مان کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ لیں۔ یہ سب وصف اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ پانی کی کوئی تاثیر اپنی نہیں کہ اسے ’’جل دیوتا‘‘ قرار دے کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں۔ اس میں جو تاثیر ہے وہ اللہ کی پیدا کردہ ہے۔ پھول میں حسن اپنا نہیں بلکہ اللہ کا پیدا کردہ ہے۔ جو انسان صرف پھول کی تعریف کرتا ہے وہ بڑا ہی ظاہر بین ہے۔ حقیقت تک پہنچنے والا انسان جب پھول کی خوبصورتی کو دیکھے گا تو اُس کی زبان سے ’’سبحان اللہ!‘‘ کے الفاظ نکلیں گے۔

ہماری تہذیب میں‘ ہمارے تمدن میں‘ یہ فکر اس طرح سرایت کیے ہوئے ہے کہ آپ نے پانی پیا‘ پیاس بجھی‘ بے کلی اور بے چینی دور ہوئی تو آپ کی زبان سے کلمہ نکلا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! پانی کی تعریف نہیں ہے‘ پانی میں کوئی وصف نہیں ہے‘ یہ وصف اللہ کا ہے‘ تعریف اللہ کی ہے۔ پھول دیکھا اور پھول میں آپ کو حسن و رعنائی اور رنگ و بو کی نہایت حسین آمیزش نظر آئی تو کہا: سُبْحَانَ اللّٰه! سورۃ الکہف میں آیا ہے: ﴿وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ

جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ ﴾ (آیت ۳۹) یعنی جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا اور تُو نے دیکھا کہ باغ لہلہا رہا ہے، درخت پھلوں سے لدے ہوئے ہیں تو یہ منظر دیکھ کر کیوں نہ فوراً تیری زبان سے نکلا: مَاشَاءَ اللّٰہ! یہ جو کچھ ہے مشیتِ خداوندی سے ہے، اللہ کے بدون کسی کو کوئی قوت حاصل نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو اس شکل میں موجود ہے، اللہ نہ چاہتا تو کچھ نہ ہوتا۔ لاکھ محنتیں ہوتیں، لاکھ آب پاشی کا نظام قائم کر لیا ہوتا، لاکھ اس کے اوپر سر توڑ محنت کی ہوتی، اگر اللہ نہ چاہتا تو کچھ نہ ہوتا۔ اگر کچھ ہے تو اُس کی مرضی سے ہے۔ تو یہ تمام کلمات (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، سُبْحَانَ اللّٰہ! مَاشَاءَ اللّٰہ!) درحقیقت شرک کا سر کچلنے والے کلمات ہیں۔

یہ دوسری بات ہے کہ وہ صرف ایک عادتِ ثانیہ بن جائیں۔ سبحان اللہ، الحمدللہ، ماشاء اللہ، صرف تکیہ کلام کی حیثیت سے زبان سے نکلتا رہے اور اس کی حقیقت کا کوئی اثر آپ کے احساسات پر نہ ہو۔ اگر کسی درجے میں بھی اس کا پَرتو انسان کے باطن پر پڑ رہا ہو، اور یہ کلمات ایک گہرے تاثر کے ساتھ ادا ہو رہے ہوں تو سمجھ لیجیے کہ شرک کی جڑ کٹ گئی، اب کسی اور معبود کے لیے کیا باقی رہ گیا! کسی کے لیے نہ شکر ہے، نہ ثنا ہے۔ کُل کا کُل شکر اور ثنا اللہ کے لیے ہے۔ ہمیں جو کچھ مل رہا ہے اُس کی عطا سے مل رہا ہے۔ کھانا کھایا، چاہے کتنے ہی وسائل و ذرائع سے وہ کھانا تیار ہوا۔ کسی کاشت کار کی محنت ہے جو اُس نے زمین پر کی ہے، بیج اس نے ڈالا ہے، کھیت اس نے سینچا ہے، پھر اس فصل کو کاٹا ہے۔ پھر نہ معلوم کن کن مراحل سے گزر کر وہ دانہ بوریوں میں بھر کر کہاں سے ہو کر منڈیوں میں پہنچا ہے، پھر آپ کے پاس آیا ہے، اس کو پیس کر آٹا بنا کر اس سے روٹی پکائی گئی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کتنا لمبا سلسلہ ہے۔ مزید برآں اس گندم کے دانے کے وجود میں آنے تک سورج کی کتنی توانائی لگی ہے، کتنی قوتیں زمین کی صرف ہوئی ہیں۔ ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟

گندم کے اس ایک دانے کو بنانے کے لیے پوری کائنات لگی ہوئی ہے لیکن اس تمام سلسلہ

کو نظر انداز کر کے ہم اصل مسبّب الاسباب کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ کھانا کھا کر اگر ضعف کم ہو گیا اور بھوک کی وجہ سے جو انسان پر کمزوری تھی وہ دور ہو گئی تو فوراً زبان پر کلمات آئیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِيْنَ [20] ''اُس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور ہمیں مسلمان بنایا۔'' اب بتایئے کہ شرک کا امکان کہاں ہے؟ نہ مظاہر پرستی کا امکان رہا، نہ شمس پرستی کا امکان رہا، نہ زمین اور پانی کی پوجا کا امکان رہا۔ کسی چیز کا کوئی امکان نہیں، نہ کوئی اَن داتا ہے۔ اَن داتا ایک ہی ہے، کوئی دوسرا نہیں ہے جو کسی کو رزق بہم پہنچا سکتا ہو، صرف وہی ایک رزّاق ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝۵۸ ﴾ (الذّٰریٰت) ''یقیناً اللہ ہی سب کو رزق دینے والا، زبردست قوت والا ہے۔'' وہی ہے کہ جو رزق پہنچا رہا ہے۔ جب آپ نے یہ تمام باتیں اللہ کے قدموں میں ڈال دیں تو اب کسی اور کو دینے کے لیے آپ کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔

حمد: شکر اوّل، ثنا ثانوی

الحمد میں جو الف لام ہے اس کو کہیں گے کہ یہ حصر (یا استغراق) کا کلمہ ہے۔ کُل حمد، کُل شکر، کُل ثنا اللہ کی ہے۔ اس میں شکر کو اہمیت اولیٰ حاصل ہے اور ثنا ثانوی درجے میں ہے۔ اس پر اوّل تو میں نے یہ کچھ دعائیں سنائی بھی ہیں، ان سے بھی یہ بات پورے طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ جہاں مقامِ شکر ہے وہاں قرآن مجید اور حدیث کی دعاؤں میں لفظ حمد ملے گا۔

کھانا کھایا، بھوک مٹی، یہ مقامِ شکر ہے تو زبان پر حمد کے کلمات آ گئے۔ بیت الخلا گئے اور فضلات جسم سے خارج ہو گئے، طبیعت کو بالکل انشراح ہو گیا، ہلکے پھلکے ہو کر باہر نکلے، اب یہ مقامِ شکر ہے اور زبان پر الفاظ آنے چاہئیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنِّي الْاَذٰى وَعَافَانِيْ [21] ''اُس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھ سے اذیت بخش چیز کو دور کر دیا اور مجھے عافیت بخشی۔'' اگر پیشاب رک جائے تو کیا قیامت برپا ہو گی! اگر یہ فضلات جسم کے اندر رک جائیں تو اسی سے انسانی جسم کے نظام میں سارا فساد پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس

اذیت بخش چیز کو ہم سے دُور کر دیا' اس پر اللہ کا شکر ہے۔

اسی طرح صبح ہی صبح اُٹھے۔ رات کو سو گئے تھے' اب دوبارہ آنکھ کھلی۔ اللہ نے زندگی کا ایک نیا دن عطا کیا۔ اسی نیند کی حالت میں موت بھی واقع ہو سکتی تھی جبکہ خود نیند کو موت کی بہن کہا گیا ہے۔ نیند میں شعور سلب کر لیا جاتا ہے' اور یہ امرِ واقعہ ہے کہ ہم ہیں تو اپنے شعور ہی کے حوالے سے۔ ہمارا وجود کچھ بھی ہوا کرے' اصل شے اس میں شعور ہے اور وہ شعور نیند کی حالت میں نہیں ہوتا۔ خود شعوری ختم ہو جاتی ہے۔ صبح جب دوبارہ آنکھ کھلی اور شعور کی کیفیت محسوس ہوئی تو اب وہ مقامِ شکر آیا اور زبان پر یہ کلمات آنے چاہئیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ [۲۲] ''اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں از سرِ نو زندگی عطا فرمائی اس کے بعد کہ ہم پر موت وارد ہو گئی تھی اور اُسی کی طرف ہمارا جی اُٹھنا ہے۔'' اسی طرح ایک روز ہم اپنے ربّ کی طرف چلیں گے۔ ایک نیند اور بھی آنی ہے جس کو ہم موت کہتے ہیں۔ اس سے بھی صبح قیامت کو اُٹھیں گے' جیسے روزانہ صبح کو اُٹھ جاتے ہیں اور پھر ہم اپنے ربّ کے حضور پیش ہو جائیں گے۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل ہوا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ﴾ (ابراہیم:۳۹) یہ مقامِ شکر ہے' مقامِ ثنا نہیں ہے۔ ثنا اُس چیز میں ہوتی ہے کہ جو ایک وصف تو ہے' حسن اور کمال کا مظہر تو ہے لیکن اس سے آپ کو براہِ راست کوئی فیض نہیں پہنچ رہا۔ جہاں آپ کو کوئی چیز ملی ہے یہ مقامِ شکر ہے۔ اس واقعہ میں ایک بوڑھے انسان کو ۸۷ برس کی عمر میں ایک بیٹا ملا' پھر اللہ تعالیٰ نے سو برس کی عمر میں دوسرا بیٹا عطا فرمایا۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام ۸۷ برس کے تھے۔ جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہوئی اس وقت آپؑ سو برس کے تھے۔ اب اس مبارک موقع پر جو دعا نکلی ہے وہ حمد کا ترانہ اور شکر کے کلمات ہیں:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾﴾ (ابراہیم)

''اُس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اس بڑھاپے کے باوجود اسماعیل اور اسحاق

(جیسے فرزند) عطا فرمائے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا ربّ دعا کا سننے والا ہے۔''

جان لیجیے کہ حمد کا تقریباً تین چوتھائی حصّہ شکر ہوتا ہے جبکہ صرف ایک چوتھائی تعریف کا جزو ہے' لیکن ہمارے ہاں قرآن کریم کے تراجم میں بس تعریف ہی تعریف رہ گیا' شکر کا حصّہ ذہنوں سے بالکل خارج ہو گیا۔ اسی کے حوالے سے ہمارے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے تیسرے اور چوتھے سبق جڑ گئے۔ تیسرے سبق کا پہلا تصوّر (concept) ''شکر'' ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ ؕ﴾ (لقمٰن:۱۲)

''اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کا شکر ادا کرو۔''

اور چوتھے سبق میں پہلا کلمہ: اَلْحَمْدُ ہے' یعنی کُل کا کُل شکر اور کُل کی کُل ثنا۔

شکر اور ثنا میں مماثلت

اس ضمن میں ایک باریک بات اور بھی ذہن نشین کر لیں۔ اگرچہ میں نے شکر اور ثنا میں فرق کر کے سمجھایا ہے' تاہم ذرا گہرائی میں اُتر کر دیکھیں گے تو معلوم ہو گا کہ ان دونوں میں فرق کوئی زیادہ نہیں ہے۔ اگر کہیں کوئی حسن ہے' کوئی خوبی ہے تو چاہے آپ کو اس سے کوئی مادّی فائدہ نہ پہنچا ہو' ایک غیر محسوس فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے۔ پھول کو دیکھ کر احساسات میں ایک تازگی پیدا ہوتی ہے۔ اچھا منظر دیکھ کر باطن میں ایک انشراح کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی مظہر حسن و کمال کو دیکھ کر یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس سے بالکل کوئی فائدہ نہیں پہنچتا' کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور پہنچتا ہے' اگرچہ فائدے کے درجات مختلف ہوتے ہیں۔ ایک ہماری مادّی ضروریات ہیں۔ پیٹ کھانے کو مانگتا ہے یا کوئی اور محسوس قسم کی ضرورت پوری ہوئی۔ دوسری طرف ہمارے باطنی احساسات ہیں۔ اگر باطنی احساسات کو جلا حاصل ہوئی ہو تو یہ بھی ایک فائدہ ہے جو حاصل کیا گیا۔

ہمارے میٹرک کے نصاب میں ولیم ورڈز ورتھ کی انگریزی نظم تھی' جس کا عنوان تھا: Daffodils۔ اس کا مرکزی خیال بھی یہی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مَیں ایک روز ایسے ہی گھوم پھر رہا تھا۔ ایک پہاڑی پر پہنچا' اچانک نگاہ آگے گئی تو دیکھا کہ وادی میں

daffodils کے پھولوں کا ایک تختہ ہے جس پر وہ پھول لہرا رہے ہیں۔ ان پودوں سے پوری وادی بھری ہوئی ہے۔ ہوا چل رہی ہے اور پھولوں کا تختہ ہل رہا ہے۔

I gazed and gazed but little thought,
what wealth the show to me had brought.

مَیں دیکھتا رہا‘ دیکھتا رہا‘ لیکن اس وقت مجھے ہرگز خیال نہیں آیا کہ مجرد اس منظر کو دیکھنے سے مجھے کتنی بڑی دولت نصیب ہوئی۔

For oft, when on my couch I lie
In vacant or in pensive mood,
They flash upon that inward eye,
Which is the bliss of solitude
And then my heart with pleasure fills,
And dances with the daffodils.

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ طبیعت پر افسردگی سی ہوتی ہے‘ انسان کسی خیال میں بہت ہی زیادہ سرافگندہ ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب میں اس طرح کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہوں تو اچانک وہ پھولوں والا منظر میری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور میری طبیعت پر اس کا ایسا اثر ہوتا ہے کہ جس طرح daffodils ہوا میں رقص کررہے تھے اسی طرح میرا دل بھی اس غم کی کیفیت سے نکل کر ایک انبساط اور خوشی محسوس کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ شاعر کو یہ ایک غیر محسوس دولت حاصل ہوئی‘ وہ کوئی محسوس چیز نہیں تھی۔ لہٰذا اگر گہرائی میں اُتر کر دیکھا جائے تو شکر اور ثنا ایک ہوجائیں گے۔ جہاں جاکر یہ شکر اور ثنا ایک ہوجاتے ہیں وہی کلمہ حمد ہے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ! کُل شکر‘ کُل ثنا‘ کُل تعریف‘ کُل حمد اللہ کی ہے جو ربّ العالمین ہے۔

کُل حمد ’’اللہ‘‘ کے لیے ہے!

اب لام جو لِلّٰہِ [لِ + اللہ] میں آیا ہے اس پر بھی غور کرلیجیے۔ لام حرف ’’جار‘‘ ہے اور عربی میں بہت سے معنی دیتا ہے‘ لیکن یہاں دو معنی ضرور ذہن میں رکھیے۔ ایک تو یہ [اختصاص] کہ کُل تعریف اللہ ہی کے لیے ہے‘ اسی کو اس کا حق پہنچتا ہے‘ مستحق وہی ہے۔

دوسروں کو تو ہم صرف اتنا ہی دے سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ دلوا دے۔ جیسے ’’آیت الکرسی‘‘ میں ہے کہ کُل علم اللہ کے پاس ہے‘ ہاں اس میں سے جتنا وہ کسی کو چاہے دے دے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۵)

’’اور وہ احاطہ نہیں کرسکتے اللہ کے علم میں سے کسی شے کا بھی سوائے اس کے جو وہ چاہے۔‘‘

اصل میں شکر اللہ کے لیے ہے‘ البتہ اللہ ہی کا حکم ہے کہ کچھ شکر اپنے والدین کا بھی کیا کرو۔ کچھ شکر اپنے اساتذہ کا بھی کیا کرو۔ جس سے کوئی خیر حاصل ہوجائے‘ جس سے نیکی کا کوئی کلمہ میسر آجائے‘ جس نے تمہارا رخ کسی بھی درجے میں کسی بھلائی کی طرف موڑ دیا ہو‘ ان سب کا بھی شکر ادا کیا کرو۔ یہ شکر ہم ادا کررہے ہیں‘ اس لیے کہ اللہ نے ہمیں اس کا حکم دے دیا۔ جیسے فرمایا: ﴿اَنِ اشۡکُرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیۡکَ﴾ ’’کہ شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا‘‘ حالانکہ وہاں ساری بات والدین کے بارے میں تھی۔ ارشاد ہوا:

﴿وَوَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ ۚ حَمَلَتۡہُ اُمُّہٗ وَہۡنًا عَلٰی وَہۡنٍ وَّ فِصٰلُہٗ فِیۡ عَامَیۡنِ اَنِ اشۡکُرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیۡکَ ؕ﴾ (لقمٰن:۱۴)

’’اور ہم نے وصیت کی انسان کو اُس کے والدین کے بارے میں۔ اس کو اٹھائے رکھا اس کی ماں نے (اپنے پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری جھیل کر اور اس کا دودھ چھڑانا ہوا دو سال میں کہ تم شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا!‘‘

اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو مقدم رکھا کہ اصلاً تو شکر میرا ہے۔ والدین کے دل میں یہ محبت کس نے ڈالی؟ ماں جو رات بھر جاگ رہی ہے‘ کس نے اس کے دل میں یہ شفقت پیدا کردی؟ جیسے اس زمین میں روئیدگی پیدا کرنے والا مَیں ہوں‘ اسی طرح ماں کے دل میں وہ شفقت کے جذبات پیدا کرنے والا بھی میں ہوں‘ لہٰذا شکر میرا مقدم ہے۔ اصل میں تو شکر میرا ہے‘ البتہ میرے طفیل یہ شکر اوروں کے اندر بھی تقسیم ہوجائے گا۔ اسی طریقے سے تعریف تو کُل کی کُل اللہ کی ہے‘ اُسی کو سزاوار ہے‘ لیکن مجازاً ہم پھول کی تعریف کردیں تو

ٹھیک ہے‘ وہ کفر نہیں ہو جائے گا۔ البتہ ذہن میں یہ رہے کہ اصل تعریف اللہ کی ہے۔ یہ تو مجاز کے پردے ہیں کہ:

معمور ہو رہا ہے عالَم میں نور تیرا
از ماہتاب و ماہی سب ہے ظہور تیرا!

یہاں جو بھی کوئی خیر ہے‘ جو بھی خوبی اور کمال نظر آ رہا ہے وہ سب کا سب اللہ کا ہے‘ کسی شے کا اپنا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ کلمہ ہر نوع کے شرک کی جڑ کاٹ دینے والا ہے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ شکر کُل کا کُل‘ ثنا کُل کی کُل اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ ہی کی ہے۔ فی الواقع بھی اُسی کی ہے۔ اس میں سے جتنا وہ کسی کو دلوا دے یہ اس کے اختیار میں ہے۔

’’ربّ‘‘ کا معنی و مفہوم

اب ’’ربّ‘‘ کے لفظ کو سمجھیے۔ یہ ’’اللہ‘‘ کی صفت ہے۔ عربی زبان میں اس کو صفت بھی کہتے ہیں‘ نعت بھی کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ’’نعت‘‘ کا لفظ ’’نعتِ رسول ﷺ‘‘ کے لیے عام ہو گیا ہے۔ ہم جب حضور ﷺ کی صفات بیان کرتے ہیں تو وہ نعت کہلاتی ہے۔ نعت عربی گرامر کا ایک عام لفظ ہے۔ جس طرح صفت موصوف ہے اسی طرح نعت منعوت ہے۔ جس چیز کی صفت بیان کی جائے وہ منعوت ہے اور نعت صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے یہاں پر تین صفات آ رہی ہیں۔ سب سے پہلی یہ ہے کہ وہ ربّ العالمین ہے‘ تمام جہانوں کا رب۔ اب یہاں دو الفاظ جاننے ہوں گے۔ ’’ربّ‘‘ کا مفہوم کیا ہے اور عَالَمِین کسے کہتے ہیں؟

عربی زبان میں ’’ربّ‘‘ کے دو بنیادی مفہوم ہیں۔ ایک مالک اور دوسرے پرورش کرنے والا۔ ’’ر ب ی‘‘ کا مادّہ عربی زبان میں آتا ہے کسی چیز کو تربیت دینا‘ بڑھانا‘ نشوونما دینا‘ پروان چڑھانا‘ جبکہ ’’ر ب ب‘‘ کا مادّہ بھی اس کے بالکل قریب ہے۔ قریب المادہ الفاظ مفہوم میں بھی بہت مشابہ ہوتے ہیں۔ جس طرح ’’ر ب ی‘‘ سے تربیت بنا اسی طرح ’’ر ب ب‘‘ سے ’’ربّ‘‘ بنا ہے۔ ’’ربّ‘‘ وہ ہے جو ہر چیز کو نشوونما دے رہا ہو‘ پال رہا ہو‘ پوس رہا ہو۔ اس کے لیے فارسی زبان میں پروردگار‘ پرورش کنندہ اور ہندی

میں پالن ہار کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

اردو زبان کے ابتدائی قرآنی تراجم میں ہندی الفاظ کافی ہیں۔ شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے ترجموں میں بھی ہندی کے کلمات بہت زیادہ پائے جاتے ہیں‘ کیونکہ وہ آج سے پونے دو سو برس پہلے کی اردو ہے۔ ولی دکنی (۱۶۶۷ء۔۱۷۰۷ء) یا اس سے پہلے کی اردو میں آپ کو ۷۵ فیصد الفاظ ہندی کے مل جائیں گے‘ بلکہ اس کی ترکیبیں اور اس کا انداز بالکل ہندی کا سا ہو گا۔ اصل میں یہ اردو زبان میں فارسی اور عربی کا ذخیرۂ الفاظ رفتہ رفتہ غالب آیا ہے جبکہ ہندی الفاظ آہستہ آہستہ نکلتے گئے۔ چنانچہ پرانے تراجم میں پالن ہار کا لفظ مل جائے گا۔

پالن ہار‘ پرورش کنندہ‘ پروردگار (Cherisher) وہ ذات ہے جو ہر شے میں موجود دبی ہوئی صلاحیتوں کو تدریجاً نشوونما دے کر اس کے تکمیلی مقام تک پہنچانے والی ہے۔ وہ ربّ ہے‘ اور جو ربّ ہو گا وہی مالک ہو گا۔ ﴿اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ ؕ﴾ (الاعراف: ۵۴) ’’یاد رکھو! وہی پیدا کرتا ہے اور اُسی کا حکم چلتا ہے۔‘‘ جو خالق ہے اسی کو اس بات کا اختیار ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ جس نے پرورش کی ہے‘ جو پالن ہار ہے‘ جو پروردگار ہے وہی مالک بھی ہے۔ تو لفظ ربّ مالک کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ ربّ البیت‘ ربّ الدار گھر کے مالک‘ گھر کے آقا کو کہیں گے۔ جو صاحب البیت ہے وہی ربّ البیت ہے۔ اسی معنی میں فرعون نے دعویٰ کیا تھا: ﴿اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی ﴿۲۴﴾﴾ (النازعات) ’’مَیں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔‘‘ وہ بھی اتنا احمق اور پاگل نہیں تھا کہ یہ سمجھتا ہو اور یہ دعویٰ کرتا ہو کہ مَیں آسمانوں اور زمین کا خالق ہوں اور نہ لوگ اتنے پاگل تھے کہ اس کو اپنا حقیقی ربّ مان لیتے۔ کتنے ہی بڑے بوڑھے وہاں ہوں گے جنہوں نے فرعون کی پیدائش کا وقت بھی دیکھا ہو گا اور اس کو گھٹنوں کے بل چلتے بھی دیکھا ہو گا۔ اس کو کیسے کوئی مان لیتا کہ یہ خالق ہے۔ اصل میں اس کا دعویٰ ﴿اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی﴾ اس معنی میں تھا کہ اختیار میرا ہے۔ اسی آیت کی شرح سورۃ الزخرف میں آتی ہے جہاں اُس نے کھل کر اپنے دعوے کو بیان کیا ہے:

﴿ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ ﴾ (آیت ۵۱)

''کیا مصر کی پادشاہی میری نہیں ہے' اور یہ سارا آبپاشی کا نظام میرے ہاتھ میں نہیں ہے؟''

مَیں جس کو چاہوں اور جتنا چاہوں پانی دے دوں۔ جس طرف مَیں پانی دے دوں تو ادھر کی زمینیں جل تھل ہو جائیں گی' ان میں خوب فصل آئے گی اور مَیں جدھر کا پانی چاہوں کاٹ دوں۔ یہ اختیار میرا ہے۔ جب اختیار میرا ہے تو حکم بھی میرا چلے گا۔ مالک مَیں ہوں۔ مَلِك اور مٰلِك میں کچھ فرق بھی نہیں ہے۔ سورۃ الفاتحہ کی تیسری آیت میں ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ آتا ہے۔ اس کی ایک اور قراءت مَلِكِ یومِ الدّین بھی ہے۔ مصری قراء سے آپ نے یہ قراءت سنی ہو گی۔ تو مَلِك کا معنی ہوا بادشاہ' صاحبِ اختیار جبکہ مالک بھی صاحبِ اختیار کو کہتے ہیں۔ جو کسی شے کا مالک ہے اسی کو اختیار حاصل ہے کہ زیر ملکیت شے کے بارے میں جو چاہے کرے۔ لہٰذا ''ربّ'' کے اندر یہ مفہوم ہے۔ اسی معنی میں فرعون نے دعویٰ کیا تھا کہ مصر میں اختیار میرا چلے گا کیونکہ یہاں کا ربّ میں ہوں' یہاں کا مالک اور مختار میں ہوں۔

نظری اور عملی اعتبار سے توحید کی تکمیل

سورۃ فاتحہ میں ہم پڑھتے ہیں: رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ' یہاں ''رَبِّ'' کی زیر کیوں ہے؟ یہ مجرور کیوں ہے؟ اس لیے کہ لفظ اللہ پر زیر آئی ہے تو اب ان آیات میں لفظ اللہ کے ساتھ جڑی ہوئی تمام صفات زیر کے ساتھ آئیں گی۔ البتہ جب علیحدہ کہا جائے گا کہ تو ''ربُّ العالمین'' کہا جائے گا۔ جب ''رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ'' کے معنی واضح ہو گئے کہ تو غیر اللہ سے ملکیت کی نفی ہو گئی۔ یہاں کی ہر شے کا مالک اللہ ہے' ہر شے کا مختار مطلق اللہ ہے۔ عملی اعتبار سے سوچیے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہنے سے نظری اعتبار سے توحید کی تکمیل ہو گئی اور رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہنے سے عملی اعتبار سے توحید کی تکمیل ہو گئی کہ مالک وہ ہے تو اختیار بھی اُسی کا چلے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ))(۲۳)

''مخلوقات میں سے کسی کی اطاعت نہیں ہو گی جس میں خالق کی معصیت لازم آتی ہو۔''

ربّ وہ ہے' مالک وہ ہے' ملکیتِ تامہ اُسی کی ہے۔ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے یہ فریب ہے کہ یہ میرا ہے۔ تمہارا کہاں ہے' یہ اللہ کا ہے۔ ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ما ست
درحقیقت مالکِ ہر شے خدا ست!

تمہیں محسوس ہوتا رہا ہے کہ اختیار تمہارے ہاتھ میں ہے' جو چاہو کر گزرو۔ یہ بھی بہت بڑا دھوکا ہے اور لازماً اس کے غلط نتائج نکلیں گے۔ تم اسے غلط استعمال کر بیٹھو گے۔ تمہارے لیے صحیح روش یہ ہے کہ اپنے اختیارات اللہ ہی کے قدموں میں ڈال دو' اس لیے کہ اصل میں یہ اختیار اسی کا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ''رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ'' کے الفاظ نے درحقیقت عملی شرک کی ساری جڑ کاٹ دی ہے اور ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کے الفاظ نے شرک کی طرف لے جانے والے نظری' فکری اور اعتقادی سارے راستے بالکل بند کر دیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس پہلی آیت سے نظری اور عملی دونوں اعتبارات سے توحید کا بیان مکمل ہو گیا۔

''العَالَمِین'' کا معنی و مفہوم

لفظ عالَم اصل میں کسی بھی چیز کے لیے ایک مجموعی اور collective نام ہے اور عالَمین اس کی جمع ہے بمعنی تمام جہان۔ مختلف اعتبارات سے کئی عالَم ہیں' مثلاً عالَمِ دنیا' عالَمِ آخرۃ' عالَمِ برزخ۔ یہ تین عالَم تو وہ ہیں جو ہم جانتے ہیں۔ یہ عالَم دنیا ہے' آج یہاں آنکھ بند ہوئی تو آپ عالَمِ برزخ میں پہنچ گئے' اور وہاں سے جب اللہ کے اذن سے اُٹھنا ہو گا تو عالَمِ آخرۃ شروع ہو جائے گا۔ پھر یہ کہ عالَمِ اجساد اور عالَمِ ارواح' اس وقت بھی یہ دونوں عالَم موجود ہیں۔ اسی طرح عالَمِ انس' عالَمِ جن' عالَمِ ملائکہ' یہ تین عالم اب بھی موجود ہیں۔ پھر عالَمِ خلق اور عالَمِ امر ہیں۔ گنتے چلے جایئے۔ یہاں اس کی تعیین کی ضرورت نہیں بلکہ صرف حصر اور احاطہ مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے اور کُل حمد اور کُل ثنا اُسی کی ہے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ غور کیجیے کہ اگر یہ پہلی آیت

ہی واقعتاً انسان کے احساسات اور شعور کی گہرائیوں سے نکلی ہو تو شرک کی تمام صورتوں کا یہاں ابطال ہو جاتا ہے۔ صرف ٹیپ ریکارڈر کی طرح ایک چیز زبان سے ادا ہو رہی ہو اور انسان کو اس کا شعور تک نہ ہو تو بات دوسری ہے۔

رحمٰن اور رحیم: چوٹی کی صفات

چونکہ شرک ایک منفی پہلو ہے لہٰذا اس کا ابطال کرنے کے بعد اب جو اگلی آیت آ رہی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی جو مثبت صفات ہیں' اُس ذات کی صفاتِ محمودہ میں سے چوٹی کی صفت ''رحمت'' سے دو نام آئے ہیں' جو ایک ہی آیت میں آ گئے ہیں۔ فرمایا: ﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝﴾ ''بے پایاں رحمت کرنے والا اور مسلسل رحمت کرنے والا۔'' دونوں الفاظ مجرور ہیں' ان پر زیر آ رہی ہے۔ اس لیے کہ یہ نام اُسی اللہ کے لیے بطورِ صفات آ رہے ہیں۔ چونکہ لفظ اللہ پر لامِ حرفِ جار کی وجہ سے زیر آیا تو یہ زیر آگے بیان ہونے والی صفات پر چلتا جائے گا: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝﴾۔ اصل میں principal clause ہے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ اور اگلی دو آیات subordinate cl auses ہیں۔

''رحمان اور رحیم'' دونوں کا مادّہ ایک ہی ہے ''رحمت''۔ سب سے پہلے اس رحمت کی اہمیت کو جان لیجیے۔ انسان سب سے زیادہ محتاج اللہ تعالیٰ کے رحم اور اس کی رحمت کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی انسان سے اپنے عدل کے مطابق حساب لے لیا جیسا کہ حساب لینے کا حق ہے' تو وہ مارا جائے گا بلکہ تباہ و برباد ہو جائے۔[۲۴] اس لیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی کس کس نعمت کا حساب دے سکیں گے؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝﴾ ''پس تم دونوں (گروہِ جنّ و اِنس) اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کا انکار کرو گے؟'' (سورۃ الرحمٰن میں یہ جملہ بار بار آیا ہے)

سمجھانے کے لیے بعض احادیث میں ان چیزوں کو تمثیل اور واقعہ کے پیرائے میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص بہت ہی عابد اور بہت ہی زاہد تھا' اس کی عبادت سالہا سال پر محیط تھی۔ اسے اپنی عبادت پر تھوڑا سا غرور ہو گیا' کچھ زعم ہو گیا کہ میں نے

تو بڑی عبادت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو امتحان میں ڈالا۔ ایک وقت میں کوئی ایسی کیفیت ہوئی کہ شدید پیاس سے دوچار ہو گیا۔ اردگرد کہیں پانی نہیں ہے۔ اس وقت پھر کوئی فرشتہ امتحان کی غرض سے آتا ہے اور کہتا ہے: یہ دو گھونٹ پانی ہے' کیا اس کے بدلے میں اپنی ساری عبادت دو گے؟ اس وقت پیاس سے جان پر بنی ہوئی تھی' اس نے دو گھونٹ پانی کے عوض اپنی کُل عبادت کا سودا کر لیا۔

یہ صورتِ حال ہم اپنے اوپر طاری کر کے سوچ سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ہوا نہ ہو اور حبس شدید ہو جائے تو جان پر بن جاتی ہے۔ عام طور پر ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ہوا بھی کوئی نعمت ہے' لیکن ذرا اس ہوا کا پریشر کم ہو جائے تو اس کی قدر و قیمت معلوم ہو جاتی ہے۔ جو لوگ ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں وہ ہر مرتبہ یہ وارننگ سنتے ہیں کہ اگر سفر (فلائٹ) کے دوران کہیں ہوا کا توازن بگڑ جائے تو آکسیجن کا اہتمام موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ ہوا کتنی بڑی نعمت ہے جس کی ہم کوئی قیمت ادا نہیں کرتے۔ یہ پانی کتنی بڑی نعمت ہے۔

ہمارا ایک ایک جوڑ جو حرکت کر رہا ہے اس کا چلنا اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت اور کتنا بڑا احسان ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ہر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے' انسان کے ہر جوڑ کی صحت اور درستی پر اس کے ذمے ایک صدقہ (بطور شکر) واجب ہے۔[۲۵] ہم کتنا شکر کر سکتے ہیں؟ ایک جگہ پر شیخ سعدیؒ نے اس کو بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''پس بر ہر نفس دو شکر واجب است!'' یعنی ہر سانس پر دو مرتبہ اللہ کا شکر واجب ہے۔ سانس جب انسان کے جسم کے اندر جاتا ہے تو وہ موجبِ تقویت ہوتا ہے۔ آکسیجن اندر گئی' اسی آکسیجن کو آپ نے جلایا' آپ کو انرجی ملی اور جب وہ سانس باہر نکلتا ہے تو وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ اور نہ معلوم کیا کیا کچھ لے کر نکلتا ہے۔ اس طرح یہ جسم کی صفائی کا ذریعہ بن رہا ہے۔ لہٰذا ازروئے عقل ہر سانس پر دو مرتبہ شکر کرنا واجب ہے۔

اب سوچیے' اگر اللہ تعالیٰ حساب لینے پر آ جائے تو کیا بنے گا؟ اسی لیے وہ دعا ہے: ((اَللّٰھُمَّ حَاسِبۡنِیۡ حِسَابًا یَسِیۡرًا))[۲۶] ''پروردگار! مجھ سے آسان حساب لیجیو۔'' ہم تیرے فضل اور تیری رحمت کے امیدوار ہیں۔ اپنے عمل پر ہمارا تکیہ نہیں ہے۔ رحمت کے

بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی شخص بھی اپنے عمل اور نیکی کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔'' اس پر کسی صحابی نے بڑی ہمت اور جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے سوال کر لیا کہ: حضور ﷺ! کیا آپ بھی نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَلَا اَنَا، اِلَّا اَنْ یَتَغَمَّدَنِیَ رَبِّیْ بِرَحْمَةٍ)) [۲۷] ''ہاں! میں بھی نہیں، مگر یہ کہ میرا رب مجھے اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے۔'' اگر محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا یہ معاملہ ہے تو ہما شما تک کہاں بات پہنچے گی کہ ہم اپنے عمل پر نازاں ہو جائیں۔ ہمیں اگر تکیہ ہے تو صرف رحمتِ خداوندی پر ہے۔

اس رحمت کے لیے یہاں دو الفاظ آئے: الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ- اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے یہ نام قرآن کریم میں کثرت سے بار بار آئے ہیں۔ ۱۱۴ مرتبہ تو یہ آیت بسم اللہ میں آ گئے۔ ۱۱۳ مرتبہ ہر سورت (سوائے سورۃ التوبہ) کے شروع میں اور ایک مرتبہ سورۃ النمل کے درمیان میں آیت بسم اللہ آئی ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو خط لکھا تھا اور اس کا آغاز کیا تھا:

﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۳۰﴾﴾ [۲۸]

سورۃ الحشر کی آخری آیات میں بھی یہ دونوں الفاظ ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' اسی طرح جڑواں آئے ہیں۔ اسمائے خداوندی کا قرآن مجید میں یکجا عظیم ترین گلدستہ سورۃ الحشر کی آخری تین آیات میں آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۲۲﴾﴾

''وہی ہے اللہ، جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ وہ جاننے والا ہے چھپے کا اور کھلے کا۔ وہ بہت رحم کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾

''وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں۔ حقیقی بادشاہ، یکسر پاک، سراپا

سلامتی، امن دینے والا، پناہ میں لینے والا، زبردست (مطلق العنان)، اپنا حکم بزور طاقت نافذ کرنے والا، سب بڑائیوں کا مالک۔ اللہ پاک ہے اُن تمام چیزوں سے جو یہ شرک کرتے ہیں۔''

﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۴﴾﴾

''وہی ہے اللہ، تخلیق کا منصوبہ بنانے والا، وجود بخشنے والا، صورت گری کرنے والا، تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔ اُسی کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اور وہ بہت زبردست ہے، کمال حکمت والا ہے۔''

ان تین آیات میں اللہ تعالیٰ کے پندرہ نام یکجا ہیں۔ ان میں الرحمٰن اور الرَّحِیْم اسی شان کے ساتھ ہے کہ پہلی آیت کے شروع میں لفظ اللہ آیا اور پھر الرَّحْمٰن اور الرَّحِیْم، جس طریقے سے یہ الفاظ آیت بسم اللہ میں اور سورۃ الفاتحہ کے شروع میں آئے ہیں۔

الرَّحْمٰن اور الرَّحِیْم میں ایک باریک سا فرق ہے۔ کچھ لوگوں نے تو اس کے اندر یہ مفہوم پیدا کیا ہے: رحمٰن الدنیا و رحیم الآخرۃ [۲۹]۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دو شانیں ہیں۔ دنیا میں شانِ ''رحمانیت'' ظاہر ہوتی ہے اور آخرت میں شانِ ''رحیمیت'' ظاہر ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رحیم بوزنِ فعیل ہے۔ فعیل کے وزن پر صفت مشبہ آتی ہے اور فعیل میں دوام کا رنگ ہوتا ہے۔ آخرت چونکہ دائم ہے، ہمیشہ ہمیش کے لیے ہے لہٰذا رحیم کو لوگوں نے آخرت کے ساتھ متعلق مانا۔ رحمٰن فعلان کے وزن پر ہے۔ فعلان کے وزن پر عربی زبان میں وہ الفاظ آتے ہیں جن میں کسی کیفیت میں عارضی طور پر بہت جوش پیدا ہو جاتا ہو، جوش و خروش کی کیفیت ہو۔ ظاہر ہے وہ عام طور پر عارضی ہوتی ہے، لہٰذا اس اعتبار سے رحمانیت کو دنیا سے متعلق مانا گیا ہے کیونکہ یہ دنیا عارضی ہے۔ البتہ بات پوری طرح بنتی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں صفات اور دونوں شانیں بیک وقت بتمام و کمال موجود ہیں۔ وہ بیک وقت رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ ''الرحمٰن'' اور ''الرحیم'' کے مابین حرفِ عطف ''و'' نہیں آیا۔ یہ دونوں صفات علیحدہ نہیں ہوسکتیں' لہٰذا ان دونوں لفظوں کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ کمال یہ ہے کہ سورۃ الحشر کی آخری تین آیات میں جو آٹھ اسماء آئے ہیں ان کے درمیان بھی کسی آیت میں کہیں کلمہ عطف نہیں ہے۔

اس حوالے سے مولانا حمید الدین فراہیؒ نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات بغیر حرفِ عطف کے آتے ہیں وہاں اس طرف راہنمائی ملتی ہے کہ صفاتِ ذاتِ خداوندی بیک وقت موجود ہیں' ان میں کوئی تقدیم وتاخیر نہیں ہے' کوئی زمانی فصل نہیں ہے' کہ ایک وقت میں ایسا ہوتا ہے اور ایک وقت میں ایسا۔ معاذ اللہ! یہ تو ہمارا تصوّر ہے۔ ہماری کیفیات ایسی ہوتی ہیں کہ ہمارے اندر ایک وقت میں خوشی ہوگی تو دوسرے وقت غمی ہوگی۔ کسی وقت طبیعت میں کشادگی ہوگی تو کسی وقت طبیعت میں تنگی کی کیفیت ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات میں کہیں اس نوع کی دوئی نہیں ہے۔ اللہ کی ذات واحد ہے اور بآنِ واحد اُس کی تمام صفات اس میں بیک وقت موجود ہیں۔ تو الرحمٰن اور الرحیم کا کوئی وہ مفہوم ہمیں تلاش کرنا ہوگا جس میں علیحدہ علیحدہ زمانی یا کیفیاتی بُعد اور فصل والا معاملہ نہ ہو بلکہ بیک وقت وہ تسلیم کیا جائے۔

(جاری ہے)

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

حواشی

(۱۱) صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ' ح:۳۹۵

(۱۲) ہمارے منتخب نصاب کا تیسرا درس سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل ہے' جس کی ابتدائی آیات میں شکر سے متعلقہ مضامین ہم پڑھ چکے ہیں۔ ان کو آگے بڑھ کر ذرا سمجھیے تو سورۃ الفاتحہ کا پہلا حصّہ گویا انہی کا تسلسل ہے۔ فرمایا: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ ذہن میں رکھیے گا کہ حقیقت واقسامِ شرک پر کی گئی تقریروں میں جو مضامین آئے ہیں' آج ان کا ذکر دوسرے رُخ سے آجائے گا۔ توحید' شرک کی ضد ہے اور توحید پر سورۂ فاتحہ کا یہ حصّہ نہایت جامع ہے اس لیے کہ سورۂ فاتحہ کے نصف اوّل میں توحیدِ خداوندی اور معرفتِ خداوندی کا تذکرہ ہے۔

(۱۳) آل عمران:۱۴۴ و الاحزاب:۴۰ و محمد:۲ و الفتح:۲۹

(۱۴) صحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب فی اسمائہ ﷺ۔

(۱۵) سنن الترمذی' ابواب المناقب' باب فی فضل النبی ﷺ۔

(۱۶) حوالہ سابقہ

(۱۷) سنن الترمذی' ابواب تفسیر القرآن' ح ۳۱۴۸

(۱۸) سنن الترمذی' ابواب الدعوات' ح ۳۵۱۹

(۱۹) صحیح مسلم' کتاب الطھارۃ' ح ۵۳۴

(۲۰) سنن ابن ماجہ' کتاب الاطعمۃ' باب مایقال اذافرغ من الطعام' ح ۳۲۸۳

(۲۱) سنن ابن ماجہ' کتاب الطھارۃ۔

(۲۲) صحیح البخاری' کتاب الدعوات' ح ۶۳۲۴

(۲۳) رواہ فی شرح السُنۃ' بحوالہ مشکاۃ المصابیح' ح:۳۶۹۶

(۲۴) حدیث نبویؐ: ((وَمَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ هَلَكَ)) (صحیح البخاری' ح ۴۹۳۹۔ وصحیح مسلم' ح ۲۸۷۶)

(۲۵) صحیح البخاری' ح ۲۹۸۹ و صحیح مسلم' ح ۱۰۰۹

(۲۶) مشکاۃ المصابیح' ح ۵۵۶۲ بحوالہ مسند احمد' امام البانی نے اس کو ''جید'' قرار دیا ہے۔

(۲۷) صحیح مسلم' کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار' ح ۷۱۱۳

(۲۸) علاوہ ازیں ''المعجم المفہرس للالفاظ القرآن'' میں محمد فواد عبدالباقی کے شمار کے مطابق لفظ ''الرَّحْمٰن'' ۵۷ دفعہ اور لفظ ''الرَّحیم'' ۹۵ دفعہ قرآن کریم میں وارد ہوا ہے۔

(۲۹) البتہ ''رحمان الدنیا والآخرۃ ورحیمھما'' کے الفاظ متعدد اسانید کے ساتھ روایت ہوئے ہیں' ملاحظہ ہو: الدر المنثور فی التفسیر والماثور للسیوطی' ج ۱' ص ۲۴۔

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں' آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

عورت جنسِ تجارت نہیں ہے!

شجاع الدین شیخ

مغربی تہذیب ایک عرصے سے اپنے طے شدہ سوشل انجینئرنگ ایجنڈے پر کاربند ہے اور مملکتِ خداداد پاکستان میں بھی اسے اپنے دجالی ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے دست و بازو میسر ہیں۔ اس نام نہاد مہذّب مغربی تہذیب کی تقلید نے ہمارے معاشرے میں عورتوں کو اُن کے اسلامی حقوق و فرائض سے دُور کر دیا ہے۔ اب وہ سڑکوں پر آ کر یا سوشل میڈیا پر اوچھی حرکتیں کرتے ہوئے ایسے مطالبات کرتی ہیں جن کا پس منظر اور پیش منظر بھی انہیں معلوم نہیں ہوتا۔ بہت سی تو محض اس لیے عورت مارچ جیسی سرگرمی میں شرکت کے لیے آ جاتی ہیں کہ کچھ شہرت ہو جائے گی۔

قارئین کرام! دینِ اسلام ایک کامل ضابطہ حیات ہے جو مرد اور عورت دونوں کے لیے زندگی کے انفرادی اور اجتماعی گوشوں میں مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی آمد سے قبل دورِ جاہلیت میں عورت کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ حقیقت میں تو انہیں غلاموں سے بھی کمتر حیثیت حاصل تھی۔ اُنہیں ایسی ہی پراپرٹی سمجھا جاتا تھا جیسی بھیڑ بکریاں یا دیگر اموال‘ حتیٰ کہ باپ کے مرجانے کے بعد اُس کی بیویوں کی حیثیت بھی متروکہ مال کے برابر ہی تھی۔ یہ قرآن و سُنّت کی تعلیمات ہی تو تھیں کہ دنیا میں پہلی مرتبہ عورتوں کو نہ صرف اُن کے حقوق دیے گئے بلکہ اُنہیں عملی طور پر نافذ بھی کر دیا گیا۔ جہاں بیٹیوں کو بوجھ سمجھا جاتا تھا اور اُنہیں پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا تھا‘ وہاں ان کو اس قدر اہمیت ملی کہ دو بیٹیوں کی اچھی طرح سے پرورش کرنے والے کو جنت کی بشارت دے دی گئی۔ عورتوں کو وراثت میں حق دار قرار دیا گیا۔ آج مہذب ہونے کے دعوے دار کئی نظام ہائے زندگی عورت کو نہ تو جائیداد کا وارث تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی اُن کو صائب الرائے تصور کیا جاتا ہے۔ اسلام نے عورت کو

شرفِ انسانیت بخشا اور بحیثیت انسان اُس کے حقوق کا تعین کیا۔

دنیا بھر کی خواتین کو ورغلانے والا مغربی ایجنڈا کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ انسانی حقوق کے چیمپئن ہونے کے دعوے دار امریکہ میں صرف ایک سو سال پہلے کسی عورت کو ووٹ کا حق ملا جبکہ مسلمان عورتوں کو یہ حق چودہ سو سال پہلے مل گیا تھا۔ عورتوں کو برابری کے حقوق دینے کے لیے آج سب سے زیادہ آواز اٹھانے والے ملک امریکہ میں گزشتہ دو سو سال سے کوئی خاتون صدر نہیں بنی مگر اس کے ایجنڈے پر عمل کرتے ہوئے کئی اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں خواتین سربراہ مملکت یا حکومت بنی ہیں‘ اگرچہ کسی اسلامی مملکت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

درحقیقت اسلام نے عورت کو جو عزت بخشی تھی آج مغربی تہذیب نام نہاد آزادی اور حقوق کے نام پر وہ اس سے چھیننا چاہتی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ مغربی معاشرے میں عورت کی حیثیت مالِ تجارت سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں عورت کو بے پردہ کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ آج ہمارے ہاں ایک طبقہ مغرب والوں کو مہذب اور خود کو دقیانوس خیال کرتا ہے۔ اپنے اسی احساسِ کمتری کو دور کرنے کے لیے وہ مغرب سے آنے والی ہر بات کو اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغرب والے کب سے ایسے مہذب ہوئے ہیں؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء سے پہلے وہاں پر بھی عورت اور مرد باقاعدہ شادی کیا کرتے تھے۔ اُن کے گھر‘ خاندان اور بچے ہوتے تھے۔ بچوں کو والدین کا ادب کرنا سکھایا جاتا تھا۔ ۱۹۴۵ء سے پہلے کسی عورت کا اگر ٹخنہ بھی برہنہ ہوتا تو اُس کو برا سمجھا جاتا تھا۔ عورتوں کا لباس مکمل ہوتا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا Sexual ریز ولوشن آیا تو نکاح‘ شادی‘ گھر اور خاندان کا تصور ہی ختم ہوتا گیا۔ اِن حالات میں بخوبی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب ۱۹۶۰ء سے پہلے مہذب تھا یا بعد میں ہوا!

اسلام نے ہی پہلی مرتبہ عورت کو تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا۔ حضرت عائشہ صِدّیقہ ؓ سمیت کئی صحابیات نہ صرف عالمہ تھیں بلکہ کئی احادیث کی راوی بھی تھیں۔ عورت کا اوّلین دائرۂ عمل اُس کا گھر ہے‘ لہٰذا وہ صرف اپنے دائرہ کار میں فرائض کی ادائیگی کے لیے حصولِ علم کی ذمہ دار ہے اور اِسی حد تک اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہے۔ اس کے لیے لازمی تعلیم صرف وہ ہے جو اُس کو ایک بہترین بندی‘ بیوی‘ بہن‘ بیٹی اور ماں بننے کے لیے درکار ہو۔ عورت کو کمائی کے

لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی تمام ضروریات کو پورا کرے۔ البتہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے یعنی اُن شعبوں میں جہاں پردہ کا اہتمام اور مَردوں سے اختلاط کا امکان نہ ہو' جائز کاروبار یا کسی بھی شعبہ میں ملازمت کر کے کسبِ معاش کا حق بھی اُسے حاصل ہے۔ اسلام نے عورت کو نہ صرف حقِ ملکیت دیا بلکہ اپنی ملکیت میں موجود مال پر تصرف کا پورا اختیار بھی دیا ہے۔ وراثت میں عورتوں کا حصّہ مقرر کیا گیا اور اُسے حدود اللہ قرار دیا ہے۔

اسلام ایک عورت کو اپنے شوہر کے انتخاب کا حق دیتا ہے۔ نکاح کرنے کی صورت میں مہر کو عورت کا حق قرار دیا گیا جس کا ادا کرنا شوہر پر لازم ہے۔ نکاح سے پہلے ایک عورت کی کفالت کی مکمل ذمہ داری اُس کے والد یا بھائی پر ہے جبکہ نکاح کے بعد اُس کے شوہر پر۔ اگر اُس کا کوئی بھی کفیل نہیں ہے تو ریاست اُس کی مکمل کفالت کرتی ہے۔ ناپسندیدہ' ظالم یا ناکارہ شوہر سے عورت کو خلع اور تفریق کا حق دیا گیا ہے جو آج بھی کئی تہذیبوں میں کسی عورت کو حاصل نہیں ہے۔ بیوہ اور مطلقہ کو دوبارہ نکاح کا غیر مشروط حق دیا گیا ہے۔

عورت مسلم ہو یا غیر مسلم' تعلیم یافتہ ہو یا اَن پڑھ' اُس کا حق ہے کہ معاشرے میں اُسے باوقار حیثیت دی جائے۔ تجارت کی افزائش کے لیے اشتہاری شے نہ بنایا جائے اور نہ ہی ونی' سوارہ' کاروکاری اور قرآن سے شادی جیسی باطل' فرسودہ اور غیر اسلامی رسومات کی بھینٹ چڑھایا جائے۔ حکومت کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں اسلام کے معاشرتی نظام کے سنہری اصولوں کو مکمل طور پر قائم اور نافذ کرے۔ عورتوں کو وہ تمام حقوق دیے جائیں جو اسلام نے طے کیے ہیں۔ مغرب کی دجالی یلغار کے سامنے بند باندھا جائے تاکہ ایک صالح معاشرہ تشکیل پا سکے اور ہماری آئندہ نسلوں کو مغربی تہذیب کی شیطنت سے محفوظ رکھا جا سکے۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

اسرائیل نواز کمپنیوں سے معاہدے؟

شجاع الدین شیخ

کھیلوں کے مقابلے کبھی صرف اِس لیے ہوتے تھے کہ بہترین کھلاڑی اور ٹیم کی صلاحیتوں کو تسلیم کرتے ہوئے اُس کو انعام و اکرام دیا جائے۔ ایسے کھلاڑی حقیقت میں زندگی کے دیگر معاملات میں بھی عام لوگوں سے بہتر ہی ہوتے تھے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں جہاں اور بہت سے شعبوں میں مادہ پرستی آئی ہے' وہاں کھیلوں میں بھی یہ خرابی دَر آئی ہے۔ اب کسی بھی کھلاڑی کی اصل پہچان صرف اور صرف اُس کا کھیل ہی ہے۔ اُس کا کردار یا اخلاق کیسا ہے' یہ امر ثانوی بلکہ غیر ضروری ہو کر رہ گیا ہے۔ کھلاڑیوں کے ذاتی کردار اور اخلاق کے حوالے سے ماضی میں ایسی کئی خبریں سامنے آچکی ہیں جن سے شاید اُنہیں خود تو کوئی خاص فرق نہیں پڑا مگر ملک و قوم کو اُن کی وجہ سے بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اِس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اِس حمام میں تقریباً سب ہی برہنہ ہیں۔ میچ فکسنگ ہو یا کسی بیرونی عنصر کے ایما پر اپنی کارکردگی میں تبدیلی لانا ہو' اب یہ ایک معمول کی بات ہے۔ یہی وجہ کہ اب سنجیدہ طبقے نے کھیلوں کے ایسے مقابلوں میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دیا ہے جبکہ عوام کھلاڑیوں کی کارکردگی پر غم و غصہ کا اظہار کر کے اپنے جذبات کی تسکین (catharsis) کرتے رہتے ہیں۔ اربابِ اختیار بھی تسلی رکھتے ہیں کہ عوام نے catharsis کر لیا ہے تو اگلے سیزن میں اُس سے بھی آگے کی کوئی بات لے کر آجاتے ہیں جس کی خرابیاں بھی اُن پر میچوں کے دوران ہی کھلتی ہیں۔

اِس وقت کرکٹ کے نام پر ملک میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے' اُس کو ایک صحت مند سرگرمی خیال کرنا خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ پی ایس ایل جیسی لغو سرگرمی کھیل کے نام پر جوئے' سٹے اور بے حیائی کا گڑھ بن چکی ہے۔ یہ عوام کے وقت کے ضیاع کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب اسرائیل اپنے پشت پناہوں کے ساتھ مل کر فلسطین خصوصاً غزہ کے مسلمانوں پر ۲۰ ماہ سے مسلسل شدید ترین ظلم ڈھا رہا ہے' پی ایس ایل جیسی بیہودہ سرگرمی کا انعقاد درحقیقت قوم کی غیرتِ ایمانی اور دینی حمیت پر بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ ماضی میں کئی کھلاڑیوں نے کرکٹ ٹیم میں رہتے ہوئے نہ صرف خود کو بدلا بلکہ دوسرے کئی کھلاڑیوں کے کردار میں بھی اس طرح تبدیلی لائے کہ وہ منکرات سے بچ کر کھیلنے لگے۔ ایسی بھی مثال ہے کہ غیر مسلم کھلاڑیوں نے اسلام قبول کیا اور

پھر باعمل مسلمان بن گئے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسے کھلاڑیوں کو وقت سے پہلے ہی ٹیم سے فارغ کر دیا گیا اور اُن کی جگہ ایسے کھلاڑیوں کو لایا گیا جن میں منکرات سے بچ کر چلنے کا جذبہ کم از کم ہو۔ پاکستان کے ۲۴ کروڑ عوام میں سے ۲۴ لاکھ بھی شاید ایسے نہیں ہیں کہ جنہیں یہ ادراک ہو کہ پی ایس ایل اور اِس نوع کے دیگر ٹورنامنٹ دراصل فروغِ کرکٹ کے لیے نہیں بلکہ ان کا اصل مقصد فروغِ بے حیائی اور فروغِ ناجائز ذرائع آمدن ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ بیشتر مسلمان تو یہ بھی سوچنا گوارا نہیں کرتے کہ کہیں اُن کی آمدن میں سود کی تو کوئی آمیزش نہیں ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ حکمران اور اربابِ اختیار سودی نظام کو جاری رکھنے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اِن حالات میں کون یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ اِس وقت جب کہ عوام اسرائیل نواز کمپنیوں کی مصنوعات کا مکمل طور پر بائیکاٹ کر چکی ہے اور اِن کمپنیوں کو اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے بہت جتن کرنے پڑ رہے ہیں' پی ایس ایل کی تشہیری مہم کے حقوق اُن کمپنیوں کو دے دیے گیے ہیں جو اسرائیل کو فائدہ پہنچا رہی ہیں۔ اربابِ اختیار کا یہ عمل انتہائی شرم ناک ہے اور اِس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

پی ایس ایل کا اثر ورسوخ بلاشبہ بین الاقوامی ہے مگر اِس کے تمام تر اربابِ اختیار پاکستانی اور یقیناً مسلمان بھی ہیں۔ سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اسرائیل نواز کمپنیوں کو تشہیری مہم کے اختیارات دیتے ہوئے کیا اُنہیں یہ خیال نہیں آیا کہ اِس عمل سے صہیونی ریاست اسرائیل کو کس قدر خوشی ہوئی ہوگی؟ ایسے ارباب اختیار شاید یہ نہیں جانتے کہ اُن کے اس عمل سے اسرائیل اور اسرائیل نواز کمپنیاں خود کو ''فاتحِ پاکستان'' خیال کر رہی ہیں' کیونکہ اسرائیل کو دنیا میں اگر کسی ملک سے حقیقی طور پر کوئی خطرہ ہے تو وہ صرف اسلامی جمہوریہ پاکستان ہی ہے۔ پی ایس ایل کے اربابِ اختیار کو اپنی کاروباری مصروفیات کے باعث ممکن ہے یہ معلوم نہ ہو سکا ہو کہ غزہ کے مسلمانوں پر مسلسل اور شدید ترین اسرائیلی بمباری کے نتیجے میں بچوں' عورتوں اور بوڑھوں سمیت تقریباً ۶۰ ہزار مسلمانوں کو شہید کیا جا چکا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان جسدِ واحد کی مانند ہیں' جسم کے ایک حصے میں تکلیف ہو تو سارا جسم اِسے محسوس کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر علماء کرام نے قومی فلسطین کانفرنس میں اہلِ غزہ کی مدد کے لیے اسرائیل کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور اسرائیل کے تمام معاونین کے مکمل معاشی بائیکاٹ کا مطالبہ کیا ہے۔ پی ایس ایل کے اربابِ اختیار نے انفرادی طور پر اپنے اردگرد لوگوں کو مرتے ہوئے تو دیکھا ہی ہوگا۔ اُنہیں یہ بھی علم ہوگا کہ ایک دن اُنہیں بھی چلے جانا ہے' اور جاتے ہوئے وہ دنیا میں کمائی ہوئی یہ دولت یہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ایسے میں کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ وہ اب بھی اسرائیل نواز کمپنیوں کے ساتھ معاہدے ختم کر دیں اور اپنی عاقبت کو سنوار لیں!

ہاں باقی وہ رہ جائے گا!......

ایوب بیگ مرزا

جماعت کی تعریف شاید اس سے بہتر ممکن نہ ہو کہ یکساں ہدف رکھنے والے ہم مقصد افراد کا ایسا گروہ جو کسی ایک نظم سے منسلک ہو۔ یہ نظم جماعت کے دستور کے تحت قائم ہوتا ہے' اور تمام وابستگانِ جماعت اپنی ذمہ داری اس دستور کے مطابق ادا کرتے ہیں۔ وہ دستور ہی کے حوالے سے نظم بالا کو جواب دہ ہوتے ہیں اور اُن سب کی اصل وفاداری جماعت کے دستور کے ساتھ ہوتی ہے۔ جماعت کا سربراہ بھی دستور کا پابند ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں دنیا بھر میں جماعت سازی کا یہی چلن ہے۔ آج دنیا میں حصولِ قوت و اقتدار کے لیے سیاسی داؤ پیچ جو حیثیت اختیار کر گئے ہیں' اُن کی بنا پر بھی ایک کامیاب سیاست دان بننے کے لیے کسی باقاعدہ سیاسی جماعت سے منسلک ہونا ناگزیر ہے۔ دنیا کے اکثریتی حصہ میں چونکہ سیکولرازم ایک نظام کی حیثیت سے تسلط حاصل کر چکا ہے' اس ماحول اور پس منظر میں مذہب اور ریاست بہتے دریا کے دو کناروں کی طرح ہیں' جو کبھی مل نہ سکیں گے۔ لہٰذا آج کسی سیاسی کارکن کے دو ہی بڑے مقاصد ہو سکتے ہیں: اولاً ملک و قوم کی خدمت کی جائے اور اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ ڈالا جائے۔ دوسرا اقتدار یا سیاسی قوت کے بل بوتے پر ذاتی مفادات کی تکمیل کی جائے۔

سیاسی جماعتوں کے وجود کے حوالہ سے برصغیر یورپ سے بہت پیچھے ہے۔ یہاں مغل حکمرانوں کا خاتمہ ہوا تو سات سمندر پار سے گورے آ گئے۔ ۱۸۵۷ء تک اہلِ ہندوستان آزادی حاصل کرنے کے لیے عسکری جدّ وجُہد کرتے رہے' لیکن باہمی چپقلش کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔ بعدازاں مسلمانوں میں سے روایتی مذہبی طبقہ تو اسی راستہ پر گامزن رہا' لیکن ہندو اور عام مسلمان نے آزادی کے لیے سیاسی راستہ اختیار کیا۔ ۱۸۸۵ء میں ہندوؤں نے کانگریس کے نام سے سیاسی جماعت بنائی اور ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں نے مسلم لیگ کے نام سے سیاسی

جدّ وجُہد کے لیے جماعت تشکیل دی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ دونوں کا مطمح نظر انگریز سے آزادی کا حصول تھا' لیکن مسلم لیگ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن حاصل کرنے کی جدّ وجُہد بھی کرتی رہی' جس سے کانگریس اور مسلم لیگ میں ایک فرق واقع ہو گیا۔ کانگریس صرف یہ چاہتی تھی کہ انگریز ہندوستان سے رخصت ہو جائے۔ انگریز نے ہندوستان سے اپنی رخصتی کو اصولی طور پر قبول بھی کر لیا تھا۔ لہٰذا اختلاف صرف وقت اور رخصتی کے انداز کا تھا۔ یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ کانگریس کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے مضبوط بنیادیں فراہم کرنے اور تنظیم سازی کے لیے ہندوؤں کو مناسب وقت مل گیا جب کہ مسلم لیگ کو پاکستان بنانے کے لیے ایک زوردار تحریک چلانا پڑی' لہٰذا تنظیم سازی کا نہ وقت تھا نہ موقع۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے چونکہ مذہب کی بنیاد پر الگ وطن کا مطالبہ کیا تھا' لوگوں کو پاکستان کا مطلب لا الٰہ الّا اللہ بتایا گیا تھا' لہٰذا اس تحریک کو مذہبی جذبات کی بنیاد پر ہی آگے بڑھایا گیا۔

ہم قارئین خصوصاً تنظیم اسلامی کے رفقاء کی خدمت میں اصلاً یہ عرض کرنا چاہ رہے ہیں کہ پاکستان کی گھٹی میں جذباتیت ہے۔ اس کی تعمیراتی فزیالوجی میں جذباتیت ہے۔ لہٰذا قیامِ پاکستان کے بعد جتنی بھی نئی سیاسی اور مذہبی جماعتیں قائم ہوئیں' اُن میں لیڈر حضرات نے جذبات کو فوکس کیا۔ مثلاً مذہبی جماعتوں نے اپنے اپنے مسلک کی دُہائی دی' مسلکی جذبات کو بھڑکایا اور مسلک کی بنیاد پر الگ جماعت بنالی۔ جمعیت علمائے اسلام' جمعیت علمائے پاکستان' جمعیت اہلِ حدیث' اہلِ تشیع کی جماعت تحریک جعفریہ وغیرہ۔ سیاسی جماعتوں نے جو حقیقت میں سب سیکولر جماعتیں ہیں' بنیادی انسانی ضروریات کی تکمیل کا لالچ دیا۔ مثلاً کسی نے روٹی' کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کر کے اور کسی نے لسانی اور علاقائی تعصب کو ہوا دے کر جذبات کو بھڑکایا اور ہم زبانوں یا علاقہ پرستوں (جنہیں قوم پرست کہا جاتا ہے) کو اپنے گرد اکٹھا کر کے جماعت بنالی۔ گویا صورتِ حال یہ بنی کہ سندھ کے کراچی اور حیدرآباد جیسے بڑے شہروں میں آسانی سے لسانی بنیادوں پر جماعت بن گئی۔ اسی طرح مذہبی جماعتوں میں شیعہ حضرات کو تحریک نفاذ جعفریہ کی اور اہلِ حدیث حضرات کو جمعیت اہلِ حدیث کی دعوت دینا اور دعوت

قبول کرنا بہت آسان ہے۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں کسی بھی نوع کی عصبیت کی پکار لگا کر جماعت بنانا بھی آسان ہے اور اسے چلانا اور قائم رکھنا بھی آسان ہے۔

تنظیم اسلامی کے رفقاء سے ہمارا ٹریلین ڈالر سوال یہ ہے کہ وہ کس عصبیت کی صدا لگائیں گے؟ وہ کس طرح کے جذبات کو مہمیز لگائیں گے؟ ہم نے جو آغاز میں جماعت کی تعریف بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس میں صرف پہلے جملے کا ابتدائی جزو تنظیم اسلامی پر صادق آتا ہے' یعنی یکساں ہدف رکھنے والے ہم مقصد افراد جو ایک نظم سے منسلک ہیں۔ اس کے بعد پاکستان کی دوسری تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے تعمیری اور عملی اختلاف شروع ہو جاتا ہے۔ تنظیم اسلامی دستوری نہیں بلکہ شخصی بیعت کی بنیاد پر قائم ہے' جس کا بنیادی فلسفہ یا اصول یہ ہے کہ جس شخص کے ہاتھ پر بیعت کی جا رہی ہے اُس کے ہر حکم کی بے چون و چرا پابندی کرنا ہوگی' بشرطیکہ وہ حکم شریعت کے دائرے کے اندر ہو۔

تنظیم اسلامی نے اپنا اصل اور حقیقی ہدف رضائے الٰہی کو ٹھہرایا ہے۔ اُس کا موقف یہ ہے کہ اپنے ہدف کے حصول کے لیے نظریۂ پاکستان کو عملی تعبیر دینا لازم ہے' بلکہ تقسیم سے قبل کے نعرے میں قیامِ پاکستان کے بعد ''محمد رسول اللہ'' کا اضافہ لازم اور ناگزیر ہے۔ شریعتِ محمدیہ ﷺ کا نفاذ نہیں ہوگا تو بات محض جذباتیت تک محدود ہو کر رہ جائے گی اور نعرے لگاتے لگاتے جذبات بھی آخر کار سرد پڑ جائیں گے۔ اگرچہ پاکستان کی تمام مذہبی جماعتیں نعرہ تو نفاذِ اسلام ہی کا لگاتی ہیں' لیکن جب وہ اسے اپنے مخصوص خول سے' مخصوص لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے لگاتی ہیں تو ہم مسلک لوگ اصل دعوت کو سمجھ لیتے ہیں۔ لہٰذا وہی لپکتے ہیں جنہیں حقیقت میں پکارا جاتا ہے۔ تنظیم اسلامی نے خود کو کسی خاص مسلک سے نتھی ہی نہیں کیا ہوا' لہٰذا اُسے مسلکِ محمدی ﷺ کی صدا لگائی ہے (جس کے لیے صحیح تر اصطلاح شریعتِ محمدی ﷺ ہے) اور تمام مسلمانوں کو دعوت دینی ہے۔ شریعتِ محمدی ﷺ کے مطابق تمام زمین اللہ کی ہے اور مسلمان کے لیے مسجد کی حیثیت رکھتی ہے' لہٰذا کسی زمینی عصبیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر برتری حاصل نہیں۔ کسی گورے کو کالے پر' کالے کو گورے پر فوقیت نہیں۔ گویا رنگ' نسل اور زبان یا کسی بھی نوع کی عصبیت کی پکار نہیں لگائی جا سکتی۔

پھر یہ کہ سیکولر سیاسی جماعتوں کی طرح دنیوی ساز و سامان اور عہدوں وغیرہ کے لالچ کا کوئی سوال ہی نہیں' اس لیے کہ ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ انتخابات میں حصہ لینے پر بھی تنظیم نے خود پر پابندی لگا رکھی ہے۔ لہٰذا خالصتاً نفاذِ دین کے لیے کسی جماعت سے منسلک ہونے کی دعوت دینا اور لوگوں کو اپنے ساتھ جمع کر کے بڑی جماعت بنا لینا دنیا کا مشکل ترین کام ہے' اگرچہ ناممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۵ کروڑ میں سے چند ہزار افراد کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بخشی ہے کہ وہ تنظیم اسلامی کے رفقاء اور رفیقات کہلاتے اور کہلاتی ہیں۔ البتہ اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ مشکلات کی وجہ سے knocking ہو رہی ہے۔ ایک ہچکچاہٹ اور تذبذب کی بہرحال کیفیت موجود ہے۔ ہماری رائے میں اس حوالہ سے مختلف لوگوں کی مختلف وجوہات ہیں۔

اگر رفقاء بُرا نہ مانیں تو ہم اس knocking کو مرض کا نام دیں گے اور ساتھ علاج تجویز کرنے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً بعض ساتھی جو بڑے پُرعزم طریقے سے تنظیم میں شامل ہوئے' انہوں نے اقامتِ دین (یعنی دین کو عملاً قائم کر دینے) کو دینی اور شرعی فریضہ سمجھ لیا۔ حالانکہ ایک رفیق پر اقامتِ دین کی جِدّوجُہد لازم ہے' اسلام کا بالفعل نفاذ اس کی ذمہ داری نہیں۔ ایسا رفیق جب زمینی حقائق پر نگاہ ڈالتا ہے اور حالات کی ناموافقت اس کے سامنے آتی ہے تو تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً یا تو سست روی کا شکار ہو جاتا ہے یا جلد بازی کا مظاہرہ کر کے انقلاب کے دُنیوی ہدف کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی فکر کرنے لگتا ہے اور نتائج سے مایوسی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ اُسے اس بات کو ذہنی اور قلبی طور پر سمجھنا چاہیے کہ میری ذمہ داری تو دین قائم کرنے کے لیے سرتوڑ جِدّوجُہد کرنا ہے' مجھے تن من دھن لگانا ہے' لیکن میرا اصلی ہدف رضائے الٰہی ہے۔ کیا اللہ اپنی راہ میں مخلصانہ جِدّوجُہد کو رد کرے گا؟ سورۂ محمد کی آیت ۷ کا مطالعہ کریں' وہ تو اسے یعنی اللہ کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کو اپنی مدد قرار دیتا ہے۔ کیا وہ اپنی مدد کرنے والوں کو بھلا دے گا؟ ہرگز نہیں' ہرگز نہیں! گویا کامیابی کا امکان صد فی صد ہے تو پھر تذبذب کیسا؟ معاشرے میں انقلاب آتا ہے یا نہیں' یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ قطعی اور حقیقی اختیار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ آپ اپنا کام کریں' لوگوں کو اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کے لیے جمع ہونے اور نظم سے جڑنے کی دعوت دیں اور دیتے چلے جائیں' دیتے

چلے جائیں کہ یہی آپ کا فرضِ منصبی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے تو علامہ اقبال نے کہا تھا۔

اس دور میں سب مٹ جائیں گے‘ ہاں باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے!

ضرورت اپنی راہ پر قائم رہنے کی اور ہٹ کا پکا ہونے کی ہے۔ یاد رکھیے‘ یہ اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں اور اللہ کی مدد کے حصول کے لیے دن کا شہسوار رہنے کے ساتھ رات کا راہب بھی بننا ہوگا۔ شیطانِ لعین سے اللہ کی پناہ حاصل کرنا ہوگی۔ دوسری بہت بڑی رکاوٹ حصولِ رزق کی مشکلات ہیں۔ اپنے اور اہل خانہ کی ضروریاتِ دُنیوی کی تکمیل ہے۔ یہ رکاوٹ اور مشکل یوں تو ہر دور میں رہی ہے‘ لیکن آج بہت گھمبیر اور پیچیدہ ہوگئی ہے۔ اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اگر انسان یہ طے کرلے کہ وہ کسی تیسرے کام میں اپنا وقت ضائع نہیں کرے گا اور اپنے اوقات کا سختی سے احتساب کرے گا تو ہمارا ایمان ہے‘ اور شاید تجربہ بھی‘ کہ دینی اور تنظیمی امور کی انجام دہی کے لیے وقت نکل ہی آتا ہے۔ جسے نہیں نکالنا‘ اُسے پنج وقتہ نماز کے لیے بھی وقت نہیں ملتا۔ ضرورت عزم کی ہے۔ commitment قلبی‘ ذہنی اور روحانی ہو تو اللہ آسانیاں پیدا کردیتا ہے۔ کوئی کام ناممکن نہیں ہوتا‘ مشکل ضرور ہوتا ہے۔ صرف ہمارا امتحان درکار ہے۔ ﴿وَاُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۴۴﴾﴾ پر ہمارا یقین ہونا چاہیے۔ رفقاءِ گرامی! یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ اللہ کا کام کریں اور اللہ آپ کا کام نہ کرے!

❁❁❁

ماهنامه ”میثاق“ لاهور

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان‘ ایک علمی‘ دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربّیین‘ تعلیمی اداروں‘ لائبریریوں‘ مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست‘ احباب اور اعزّہ و اقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

یه آپ کے لیے صدقه جاریه هوگا!

جاہلیتِ جدیدہ کے خلاف جہاد بالقرآن

ڈاکٹر انوار علی☆

(تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع منعقدہ ۲۰۲۴ء کے موقع پر خطاب)

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے مارچ ۱۹۸۴ء میں ''جہاد بالقرآن'' کے موضوع پر خطاب فرمایا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے جون ۱۹۸۴ء میں ایک اور مفصّل خطبہ ارشاد فرمایا جس کا عنوان تھا: ''جہاد بالقرآن اور اس کے پانچ محاذ''۔ انہوں نے جو پانچ محاذ گنوائے' وہ بالترتیب شرک' الحاد' بے یقینی' نفس وشیطان اور فرقہ واریت تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحبؒ کی دُوررَس نگاہیں تھیں جن کی بدولت انہوں نے نہ صرف اُس دور بلکہ آنے والے اَدوار کے بدترین فتنے یعنی الحاد اور اس سے منسلک جاہلیت کے خلاف جہاد بالقرآن کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

لفظ ''جاہل'' کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو جذباتی' اکھڑ' ناشائستہ' شہوات ولذات کے سہارے جینے والا عقل پرست ہو۔ اصطلاحاً ہر وہ شے جو قرآن وسُنّت کے منافی ہو' جہالت ہے۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا:

((اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مِنْ اَمْرِ الْجَاھِلِیَّۃِ تَحْتَ قَدَمَیَّ مَوْضُوْعٌ))

(رواہ مسلم و ابوداؤد)

''خبردار' زمانۂ جاہلیت کی ساری قدریں آج میرے پاؤں کے نیچے رکھی دی گئی ہیں۔''

جہاں تک جاہلیتِ قدیمہ کی بات ہے' اس کی بنیاد نسلی تفاخر اور عصبیت پر تھی۔ فتح مکہ کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں حضرت بلال ؓ نے اذان دی تو ایک قریشی نے' جو یہ منظر دیکھ رہا تھا' اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور بولا: ''میرا باپ کتنا خوش نصیب تھا جو یہ منظر دیکھنے سے پہلے ہی دنیا سے چلا گیا''۔ یہ نسلی تفاخر ہی ہے جو انسانیت کو ہمیشہ سے درجہ بہ درجہ شرک کی دلدل میں دھنسانے کا سبب بنتا رہا ہے۔ بہرحال قدیم دور کی جاہلیت کا عملی اظہار

☆امیر تنظیم اسلامی' حلقہ کراچی شرقی

شرک کی صورت میں ہوا' جس میں خدا کا انکار تو نہیں تھا' البتہ خدائے واحد کے ساتھ دیگر خود ساختہ خداؤں کا تصور پیدا ہوتا رہا۔ وہ جس انسان کو اعلیٰ و برتر سمجھتے' اس کی تعظیم میں اتنا غلو کرتے کہ اسے خدائے واحد کا شریک ٹھہرا دیتے۔ یہ جہالت آج بھی جاری ہے اور توحید کے عَلَم برداروں کا ہمیشہ سے اسی کے ساتھ ٹکراؤ رہا ہے۔ قرآن کریم کا ایک بہت بڑا حصہ اسی جاہلیت کے رَدّ میں دلائل دیتا نظر آتا ہے۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جاہلیت کی ایک صورت الحاد یعنی خدا کے انکار کی صورت میں سامنے آئی۔ قرآن کریم میں وہ مقامات بھی نظر آتے ہیں جہاں خدا کے انکار یا بالفاظِ دیگر مادہ پرستی کی شدید الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ایک ملحد جو بظاہر کسی خدا کو نہیں مانتا' اس کا مادہ پرستی سے کیا تعلق ہے! دراصل اگر کوئی شخص خدا کے وجود کا انکاری ہے تو لازماً وہ مادہ کو خدا مانے بیٹھا ہے' کیونکہ اس کے عقیدہ کے مطابق مادہ ہی قدیم ہے' یعنی اپنا خالق خود ہے۔ مادہ پرستی کا ایک مظہر یقیناً شرک بھی ہے جس میں مبتلا شخص خدا کے وجود کا انکار تو نہیں کرتا البتہ مادہ کو ایک طاقت مانتے ہوئے خدا کے مقابل لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ مادہ پرستی کا شرک جب زور پکڑتا ہے تو انسان کا اپنے حواس اور اسباب پر توکّل اس درجہ غلبہ پالیتا ہے کہ وہ مادہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہوئے آخر کار درمیان میں سے خدا کو نکال دیتا ہے۔ انسان نے ایسا اس لیے بھی کیا کیونکہ خدا ہی وہ ذات تھی جو اسباب پرستی کی دوڑ میں اس کے سامنے حائل تھی۔ یہ ملحدین ہمیشہ سے تعداد میں بہت کم رہے ہیں البتہ پچھلے ادوار میں ان کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کا ایک بڑا سبب پاپائیت رہی ہے۔ تقریباً تین سو برس قبل جب ملوکیت اور پاپائیت کے خلاف اصلاحِ مذہب (Reformation) اور احیاء العلوم (Renaissance) کی تحریکوں نے زور پکڑا تو دورِ جدید کے تقاضوں اور کلیسا کی ہٹ دھرمی کے درمیان ہونے والی جنگوں نے بالعموم مذہب پرستوں کو مذہب بیزاروں میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔

جاہلیتِ جدیدہ اور جاہلیتِ قدیمہ

آج کے دور کی جاہلیت کو اگر اصطلاحاً بیان کرنا چاہیں تو وہ الحاد ہے۔ البتہ یہ الحاد نظری سے زیادہ عملی ہے جس کی جڑوں میں نسلی تفاخر نہیں بلکہ مال کا تفاخر ہے۔ اس معنوی الحاد میں کوئی بھی ظاہر میں اپنے قول سے خدا کے وجود کا انکاری نہیں ہے لیکن اپنی عملی زندگی میں وہ خدا سے

اس حد تک بیزار ہے کہ اس کا نام سننا بھی اسے گوارا نہیں۔ ’’خدا کی شریعت‘‘، ’’خدا کے قوانین‘‘، ’’خدا کا نظام‘‘ وہ ضربیں ہیں جو انسان کو بیخ پا کر دیتی ہیں۔ وہ ان تمام ممنوعہ اشیاء کو اپنا حق سمجھے بیٹھا ہے جن کا حصول خدا پرستی کے ساتھ ممکن نہیں۔ یہ ’’معنوی الحاد‘‘ یا ’’عملی الحاد‘‘ یا ’’الحادِ خفی‘‘ ہے جو دورِ جدیدہ کی تمام جہالتوں کی ماں ہے۔ اس معنوی الحاد کی طرف جانے والے راستے کی پہلی سیڑھی آخرت کا انکار ہے۔ ایمان بالآخرہ یعنی بعث بعد الموت ہی وہ عملی ایمان ہے جو انسان کو اس عارضی دنیا کی حقیقت سمجھاتا ہے۔ اگر یہاں کوئی کمزور ہے تو اس کا لازمی نتیجہ خدا بیزاری یا عملی زندگی میں خدا کے تصور تک کو ترک کر دینے کی صورت میں نکلے گا۔

شماریات کو سامنے رکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ملحدین کو کوئی ایسے دلائل مل گئے ہیں جن کی بنا پر وہ دنیا بھر میں پھیلتے جا رہے ہیں۔ میڈیا پر ملحدین کے اعداد و شمار یقیناً بہت نمایاں ہیں۔ صرف پاکستان ہی میں یہ تعداد لاکھوں میں پہنچ چکی ہے۔ البتہ یہ حقیقت سامنے رہے کہ الحاد پرستوں کے پاس کبھی بھی کوئی واضح دلیل نہ تھی اور نہ ہی ہے۔ ان کے دلائل کا نہ صرف مسلم علماء بلکہ غیر مسلم مفکّرین بھی بھرپور جواب دے چکے ہیں۔ عقل پرستی اور حواس پرستی اس قابل نہیں ہیں کہ علمی بنیاد پر خدا کا انکار کر سکیں۔ پھر اس سیلاب کے یوں آگے بڑھنے کی وجہ کیا ہے؟ دراصل یہ خدا کا انکار نہیں بلکہ خدا بیزاری ہے جس کی بنیادی وجہ لذات و شہوات کی دنیا میں گم گشتہ قلوب ہیں۔ ہوس زدہ عقل و فہم کو شریعت کے نام ہی سے نفرت ہو چکی ہے۔ انسان نما حیوانوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جو پابندیوں سے گھبرائے ہوئے ہیں اور حیوانیت کے اصولوں پر جینا چاہتے ہیں۔ ایک طرف شرک ہے اور دوسری طرف یہ حیوان نما انسان ہیں۔ مشرک اپنے نفس کو خدا کے ساتھ شریک کیے ہوئے ہے جبکہ حیوان نما انسان اپنے نفس کو خدائے واحد بنائے بیٹھے ہیں۔ منہ سے کہہ نہیں پاتے کہ خدا نہیں ہے لیکن جیسے ہی خدا کا نام لیا جائے تو یہ غصہ سے دانت چبانے لگتے ہیں۔ (عیاذاً باللہ!)

جاہلیت کا غلبہ

پچھلے دور میں جاہلیت عقل پرستی پر ناز کرتی تھی‘ آج اُس عقل پرستی نے تھوڑا سا خم کھایا ہے اور اب یہ طبیعیاتی عقل پرستی میں ڈھل چکی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے خدا کے انکار کی بنیاد یہ رہی کہ چونکہ وہ حواسِ خمسہ میں نہیں آتا تو نہ مانو‘ اب دلیل یہ ہے کہ چونکہ NASA کی

دوربین میں بھی خدا نظر نہیں آ رہا تو ثابت ہوا کہ وہ موجود ہی نہیں۔ یہ سب مرحلہ وار ہوا ہے۔ ذہن سازی کی گئی۔ معاشروں میں ان لوگوں کو نمایاں مقام دلایا گیا جو اندر سے خدا بیزار تھے۔ ان میں صحافی‘ مصنّفین‘ دانشور‘ خطیب (آج کی اصطلاح میں motivational speakers) اور ایسے علماءِ سوء بھی شامل ہیں جنہوں نے چیخ چیخ کر لوگوں کو زندگی کا وہ مطلب سمجھایا جس میں کامیابی صرف اور صرف مال سے وابستہ ہوتی ہے۔ کھیلوں‘ ڈراموں اور فلموں پر بلاوجہ ہی اتنی investments نہیں کی جاتیں۔ ان کے پیچھے وہی سازشی دماغ ہیں جن کا تانا بانا ابلیس سے جا ملتا ہے۔ اصلی زندگی کو غیر حقیقی معیارات کے ذریعے مصنوعی زندگی میں تبدیل کیا گیا۔ اس مصنوعی زندگی اور اس سے منسلک ضروریات کو یوں ہوا دی گئی کہ توجہات کا ارتکاز مادے پر ہوتا چلا گیا۔

کامیابی یا achievement کی تعریف بھی تبدیل کر دی گئی۔ اس کی سادہ سی مثال یہ ہے کہ آج اگر ایک مسلمان بچے کی نماز چھوٹ جائے‘ وہ روزہ نہ رکھے‘ قرآن کی تلاوت نہ کرے‘ بھلے جھوٹ بولتا ہو‘ بدکردار ہو‘ بے حیا ہو تو ان تمام باتوں سے معمولی سا فرق بھی نہیں پڑتا‘ البتہ اگر ایک دن اسکول کی چھٹی ہو جائے تو اسے غیر معمولی عمل سمجھا جاتا ہے۔ کسی امتحان میں بچے کے ۹۰ فیصد سے کم نمبر آ جائیں تو گھر میں میت کا سماں بن جاتا ہے۔ قیامت کا منظر تو تب ہوتا ہے جب میٹرک یا انٹر کے رزلٹ میں وہ مطلوبہ گریڈ نہ آئے جو ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے لیے چاہیے۔

تعلیمی نصاب اور تدریسی نظام پر خصوصی محنت کی گئی۔ آج پورے تعلیمی نظام کا نچوڑ یہ ہے کہ غلامانہ ذہنیت کے حامل ایسے نوکر (servants) پیدا کیے جائیں جو اس نظام کی خدمت میں تن من لگا دیں‘ اس امید پر کہ انہیں دھن ملے گا۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف آرام و آسائش کا حصول ہو‘ جہاں خوشی صرف bonus اور increment کا نام ہو۔ علوم ہوں کہ فنون‘ فلسفہ ہو کہ نفسیات‘ اس تعلیمی سفر سے گزرنے والا اپنی نفسانی خواہشات کا ایسا دلدادہ بن جاتا ہے کہ ایمان اور روحانیت کے نام سے بھی اسے ایک طرح کی خفت محسوس ہوتی ہے۔

ابلیسی اہل کاروں نے بڑی محنت کی اور رفتہ رفتہ پورا فلسفۂ اخلاق بدل دیا گیا۔ اخلاقی قدریں بس اتنی ہی ٹھہرائی گئیں کہ وہ ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔ صرف ایک social animal جو جبلتوں کی دوڑ میں نسبتاً کم مبتلا ہے۔ یہ انسان بس اتنا انسان ہے کہ اپنے بوڑھے والدین کو اپنے خرچ پر old house میں جمع کروا دیتا ہے تا کہ اس کی انفرادیت متاثر نہ ہو۔

کسی معاشرے کو تباہ کرنا ہو تو اس میں بسنے والے افراد کو نہیں بلکہ اس معاشرے کی اقدار کو قتل کیا جاتا ہے۔ اپنی تہذیب وتمدن کو مرعوبیت کی بھینٹ چڑھا دینے والے اذہان پیدا کیے جاتے ہیں۔ وہ اپنی زبان‘ اپنے لباس اور اپنے رہن سہن کو نحوست اور ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹ سمجھنے لگتے ہیں۔ انہیں ترقی کی تعریف ہی وہ سمجھائی جاتی ہے جس کا ان کی اپنی تہذیب وتمدن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

سب سے زیادہ کاری ضرب جو اس جنگ میں لگائی گئی‘ وہ یہ تھی کہ حیا کی تعریف تبدیل کر دی گئی۔ وہ امور جن کو بے حیائی سمجھا جاتا تھا‘ زندگی میں ایسے شامل کر دیے گئے گویا وہ انسان کے بنیادی حقوق ہیں۔ عورت کو گھر سے باہر نکالنے کے لیے دنیا کے ذہین ترین‘ فتنہ پرور افراد کے ذریعے دلائل جمع کیے گئے۔ فلم‘ ڈرامہ اور ادب میں اس معاملے کو ایسے اٹھایا گیا گویا ایک مرد سے بھی زیادہ حق عورت کا ہے کہ وہ گھر سے باہر نکلے۔ ستر وحجاب کو ایک گالی بنا دیا گیا۔ پردہ‘ چادر اور چاردیواری پر تہمتیں لگائی گئیں اور ان کا احساس کرنے والوں کو دورِ جدید کے مجرموں کی فہرست میں لا کھڑا کیا گیا۔ پچھلا دورِ جاہلیت عورت کا استحصال کرتا تھا اور اسے انسان کا درجہ دینے کو بھی تیار نہ تھا۔ آج کی جاہلیت نے عورت کو حقوق کا جھانسا دے کر اسے محض جنسی تسکین کا ایک ذریعہ بنا دیا اور المیہ یہ ہے کہ عورت کو قائل بھی کر لیا کہ یہ اس کے حق میں بہتر ہوا ہے‘ لہٰذا وہ خود اس پر بضد ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ آج کے دور کی ایک بے پردہ عورت اللہ کی طرف سے دیے گئے لازمی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اللہ کا ولی سمجھتی ہے۔

جاہلیتِ قدیمہ اور جاہلیتِ جدیدہ میں فرق یہ ہے کہ پہلے صرف اپنے خداؤں کا طواف کرتے وقت برہنہ ہوا جاتا تھا‘ جبکہ آج عام زندگی میں بے لباسی کا دور دورہ ہے۔ خدا بھی بدل گئے ہیں۔ اب مال و دولت خدا ہیں تو ان کا طواف ہو رہا ہے۔ اس فتنہ میں جو اصل رنگ بھرا گیا جس کی وجہ سے اس سیلاب نے پوری پوری نسلوں کو نگل لیا‘ وہ ہے personality complex کا مسئلہ۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں ہی نہیں‘ بڑی عمر کے افراد بھی اس بیماری کے مریض بنا دیے گئے۔ انہیں اس حال تک پہنچانے میں شوبز کی دنیا نے اہم کردار ادا کیا۔ اداکاری کرنے والے جو کسی زمانے میں میراثی اور بھانڈ کہلاتے تھے‘ انہیں ”ستاروں“ کا لقب دے دیا گیا (معاذ اللہ! جب کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام ؓ کو ”ستارے“ کہا تھا)۔

بظاہر یہ بات معمولی لگتی ہے مگر ذرا سوچیے کہ اگر کسی نوجوان پر یہ احساس غالب ہو جائے کہ وہ ”خوب صورت“، ”اسمارٹ“، ”ہینڈسم“ یا ”چارمنگ“ نہیں تو یہ امر اسے لازماً اس سوچ کی طرف لے جائے گا کہ اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ وہ یا تو ڈپریشن کا مریض بن کر کاسمیٹکس کی صنعت کے منافع کا سبب بنتا رہے گا یا ایک طرح کے انتقامی جذبہ کا شکار ہو کر پہلے تو خدا کی مخلوق سے اپنے ساتھ ہونے والے ”ظلم“ کا بدلہ لے گا اور پھر اس کا یہ غصہ بالآخر خدا پر نکلے گا (معاذ اللہ)۔ کچھ اور کر سکے یا نہیں‘ البتہ خدا کو اپنی زندگی سے ضرور نکال دے گا۔

جاہلیتِ جدیدہ کی بنیاد

جدید جاہلیت کی بنیاد تین طرح کی ذہنیتوں پر ہے: مرعوبیت‘ غلامی اور بغاوت۔ ایک ذہن وہ ہے جو مغرب کی چکاچوند سے مرعوب ہے‘ کیونکہ بظاہر نظر آنے والی سائنس وٹیکنالوجی کے کارنامے اپنی اہمیت سے کہیں زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیے گئے ہیں۔ کچھ ایجادات یقیناً ایسی ہیں جن سے انسان کو بڑی سہولت ہوئی ہے‘ لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ زیادہ تر ایجادات نے انسان سے اس کا سکون چھین کر اس کی مشکلات میں اضافہ ہی کیا ہے۔ ایک مرعوب ذہن جب اس مصنوعی ترقی کو دیکھتا ہے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مذہب انسان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ دوسری ذہنیت اصل میں غلامانہ ذہنیت ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم یہ ذہنیت اپنی عقل کا سودا کر چکی اور ان کی سوچ محض اس کلمہ کا ورد کرتی ہے کہ ”مستند ہے مغرب کا فرمایا ہوا۔“ یہ اپنا دل و دماغ اپنے آقاؤں کے حوالے کر کے بدلے میں ان سے مراعات حاصل کرنا چاہتے ہیں اور بعض اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ تیسری ذہنیت جس کی اب اکثریت ہوتی جا رہی ہے‘ بغاوت پر مبنی ہے۔ اس ذہنیت کے حامل افراد کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف حیوانی شہوات اور داعیات کی تسکین ٹھہرتا ہے۔ انسان کے جبلی تقاضوں اور ان میں سے بھی جنسی جذبہ کی مکمل تسکین نہ تو مذہب کا موضوع ہے اور نہ ہی کسی بھی شریعت کے دائرے میں ممکن ہے۔ مذہب ہو یا شریعت‘ اصل موضوع تو خدا ہی ہے‘ لہٰذا یہ باغی ذہنیت خدا کو اپنے راستے سے ہٹانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔

جہاد بالقرآن

جاہلیت چاہے قدیم ہو یا جدید‘ اس کے خلاف سب سے اہم اور مؤثر آلہ جہاد بالقرآن ہی

ہے‘ کیونکہ قرآن ہی عالمِ اسباب میں اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ یہ قرآن ہی ہے جو اللہ کے بندوں کے لیے ڈھارس بھی ہے اور ہر طرح کی جاہلیت کے خلاف لڑنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ قرآن کا منِ جانب اللہ ہونا اس کے ہر قاری پر واضح ہے۔ تمام طاغوتی قوتیں مل کر بھی اس قرآن کی مثل کچھ لانے پر قادر نہیں‘ کیونکہ یہ مخلوق کا نہیں بلکہ خالق کا کلام ہے اور خالق صرف ایک ہی ہے جو اللہ ہے۔

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۸۸﴾ (بنی اسرائیل)

”کہہ دو اگر تمام انسان اور جنات جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا لے آئیں تو وہ اس جیسا نہیں لا سکتے‘ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔“

قرآن ہی وہ خزانہ ہے جس میں علوم و معارف اور فصاحت و بلاغت کے تمام موتی پرو دیے گئے۔ آیات اور مضامین کی حسنِ ترتیب ہو‘ الفاظ کا چناؤ ہو یا اندازِ بیاں‘ ہر پہلو اس کے کلام اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ تاریخ ہو یا مستقبل‘ علومِ غیبیہ ہوں یا علومِ دُنیوی‘ ہر جہت کا بنیادی اصول اس میں ہے۔ یہ محض قرآن کا اعجاز ہے کہ اَن پڑھ ہو یا اعلیٰ تعلیم یافتہ‘ عالم ہو کہ عامی‘ خواص ہوں یا عوام‘ امیر ہو یا غریب‘ ذہین یا کند ذہن‘ طاقتور یا کمزور‘ شوہر یا بیوی‘ بھائی یا بہن‘ بیٹا یا بیٹی‘ ماں باپ یا اولاد‘ سب اپنے حصے کی ہدایت اسی سے پاتے ہیں۔ قرآن مجید قیامت تک کے تمام معاملات کے لیے رہنمائی فراہم کرنے آیا ہے:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ﴾ (النحل:۸۹)

”اور ہم نے آپؐ پر وہ عظیم کتاب نازل فرمائی ہے جو ہر چیز کا بڑا واضح بیان ہے۔“

﴿مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ﴾ (الانعام:۳۸)

”ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی۔“

﴿وَكُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا ۱۲﴾ (بنی اِسرائیل)

”اور ہم نے (قرآن میں) ہر چیز کو پوری تفصیل سے واضح کر دیا ہے۔“

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۵۹﴾ (الانعام)

”اور اللہ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں‘ انہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے۔ اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے‘ اور نہ کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں‘ اور نہ کوئی تر یا خشک چیز ہے مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے۔“

قرآن مجید جب متقین کی صفات بیان کرتا ہے تو واضح طور پر ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ (البقرة:۳) کی صدا لگا کر ظاہر پرستی کی نفی کر دیتا ہے۔ تقدیر پر کامل ایمان صرف قرآن کے قاری ہی کو حاصل ہوتا ہے جب اسے یہ سمجھ آ جاتا ہے کہ ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۲۹﴾ (التکویر) ”اور تم وہی کچھ چاہ سکتے ہو جو اللہ چاہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔“ زندگی کا مطلب اور اس کی اصل حقیقت ایک آزمائش ہے۔ امیری یا غریبی‘ صحت یا بیماری‘ خوشی یا غم سب کچھ ایک حکمت کے تحت ہے۔ یہ وہی جان پائے گا جو سمجھ لے گا کہ: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ﴾ (الملک:۲) ”جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے؟“ اور وہ شخص کبھی شکوہ نہ کرے گا جس کو یقین آ جائے کہ: ﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۴۶﴾ (حٰمٓ السجدة) ”اور آپؐ کا ربّ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔“

جاہلیتِ جدیدہ کے خلاف اگر جہاد کرنا ہے تو سب سے پہلی شے جو قرآن سے لینی ہوگی وہ ہے توکّل علی اللہ: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۱۳﴾ سورۃ التغابن کی اس آیت سے پہلے بڑے حکمت آمیز انداز میں توکّل کی جزئیات بیان کی گئی ہیں۔ اللہ بصیر ہے‘ سمیع ہے‘ خبیر ہے‘ علیم بذات الصدور ہے۔ یہ جزئیات اصل میں ایمان باللہ کے مختلف مظاہر ہیں جن پر کامل ایمان کے بغیر اللہ کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ دیکھنے اور سننے والا تو انسان بھی ہے مگر اس کی محدودیت اُس السمیع اور البصیر کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ قرآن اپنے قاری کو یہ فہم بھی دیتا ہے کہ سماعت و بصارت اور حواس ہی عقل کا منبع ہیں۔ جب یہ محدود ہیں تو عقل کیسے لامحدود ہو سکتی ہے؟

توکّل کا دوسرا عملی مظہر اللہ تعالیٰ کے ”عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ“ ہونے پر ایمان ہے۔ اللہ ہی واحد ہستی ہے جس کے فیصلے آسمانوں اور زمین پر جاری و ساری ہیں اور اسی کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔ کسی کے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا‘ صرف اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے۔ انسان

اللہ کی ذات کو ماننے سے پہلے پوری طرح اطمینان کرنے کا حق رکھتا ہے۔ وہ سوال کرسکتا ہے‘ اعتراض کرسکتا ہے لیکن جب اس کی عقل اور شعور اس بات کی گواہی دے دیں کہ یہ قرآن اُس خالق کا کلام ہے جو اللہ ہے اور وہ ایک ہے‘ تو اب اس کو یہ حق حاصل نہیں کہ اللہ کے فیصلوں پر اعتراض کرے۔ ﴿اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ⑭﴾ (طٰہٰ) ”بے شک میں ہی اللہ ہوں‘ میرے سوا کوئی معبود نہیں‘ سو تم میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کی خاطر نماز قائم کیا کرو۔“ یعنی جب اس ذات کو اللہ مان لیا ہے تو اب اُس کی بات تو ماننی ہی ہوگی۔

قرآن انسان کے فہم و شعور کو دعوت دیتا ہے کہ کائنات میں موجود ہر چیز کو دیکھے‘ تحقیق کرے‘ یہاں تک کہ خود اپنے اندر جھانکے اور اس اعلیٰ ترین مخلوق یعنی انسان کو دیکھ کر اس کے خالق کی قدرت اور طاقت کو پہچانے۔ ایک داعی جو قرآن کے پیغام کو ان لاعلموں تک پہنچانا چاہتا ہے جو جہالت کی دلدل میں ڈوبے ہوئے ہیں‘ اس کو قرآن کا یہ پہلو خاص طور پر اُجاگر کرنا ہوگا جس میں قرآن تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن ان نشانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ سورۃ الانعام میں توجّہ دلائی گئی:

﴿اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ⑲﴾

”اس کے پھل کی طرف دیکھو جب وہ پھل لائے اور اس کے پکنے کی طرف۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔“

سبحان اللہ! کیا قدرت ہے اس اللہ کی۔ ایک مردہ بیج جو زمین میں بو دیا جائے جس میں نہ تنفّس ہے‘ نہ کوئی metabolism اور پھر اچانک وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ ایک کونپل نکلتی ہے جو زمین سے اوپر کی طرف بڑھتی ہے اور دوسری جڑ ہے جو زمین کی گہرائیوں کا رخ کرتی ہے۔ جسے باہر نظر آنا ہے اس کو خوب صورت رنگ دینے والا اور جسے اندر ہی رہنا ہے اسے بے رنگ رکھنے والا وہ خالق ہی ہے جسے دیکھا نہیں جا سکتا مگر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ پودا جب پھول لاتا ہے تو نہ جانے کہاں سے اس میں دل فریب رنگ آ جاتے ہیں۔ پھر یہی پھول پھل میں بدل جاتا ہے۔ یہ پھل بدذائقہ اور سخت رہتا ہے جب تک اپنے پورے حجم کو نہ پہنچ جائے اور پھر یک دم اس میں پکنے کا عمل (ripening) ہوتا ہے جس میں اس کا چھلکا نرم اور خوشبودار ہو جاتا ہے۔ ذائقہ تو

آتا ہی ہے‘ ساتھ ہی کیسے کیسے غذائی اجزاء اس میں سما جاتے ہیں۔ انسان غور کرے کہ اگر یہ پھل پہلے دن ہی سے نرم‘ خوشبودار اور ذائقہ دار ہوتا تو پرندے اور کیڑے اس کو چٹ کر جاتے جبکہ انسان کے ہاتھ کچھ نہ آتا۔ اس مہربان خالق نے اسے محفوظ کیا تا کہ انسان کے کام آ سکے۔

جب انسان قرآن میں ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ④﴾ (التین) ”بے شک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا!“ اور ﴿وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ﴾ (المؤمن: ٦٤) ”اور تمہیں شکل و صورت بخشی تو تمہاری بہترین صورت گری کی۔“ پڑھتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ خوب صورتی کا معیار اصلاً وہ نہیں جو انسان بتاتا ہے بلکہ وہ ہے جو قرآن طے کرتا ہے۔ وہ اپنی قدر تو جان ہی لیتا ہے‘ اصلاً وہ اپنے اللہ کی قدر بھی جان لیتا ہے‘ جس نے اسے خوبصورت ترین صورت میں تخلیق فرمایا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ خوب صورتی اور ظاہری شکل و صورت کے انسانی معیارات محض distractions ہیں جن کا زندگی کے اصل مقصد سے کچھ لینا دینا نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر دو گاڑیوں میں ریس ہو رہی ہو تو کوئی بے وقوف ہی یہ کہے گا کہ فلاں گاڑی چونکہ سفید رنگ کی ہے‘ لہٰذا جیت جائے گی۔ گاڑی کا جیتنا اور اپنی منزل تک پہنچنا اس کے رنگ یا شکل پر نہیں بلکہ اس کے انجن کی طاقت پر منحصر ہے۔ اسی طرح انسان کی منزل یعنی رضائے رب کو پانے کے لیے جو کچھ بھی انسان کو چاہیے وہ ربّ نے اسے عطا کیا ہوا ہے۔ رنگ اور شکل کا اصل مقصدِ زندگی سے کچھ لینا دینا نہیں۔

اسی طرح وہ رب جو عدل کا حکم دیتا ہے وہ ناانصافی کیسے کرسکتا ہے! ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ﴾ (النحل: ٩٠) ”بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا“۔ ایک باپ اپنے بیٹوں میں سے کسی کو روز کے جیب خرچ میں سے کچھ کمی کر کے اس کے مستقبل کے لیے محفوظ کر دے تو کس طور اس باپ پر ناانصافی کا الزام لگائیں گے؟ اصل میں تو اس نے احسان کیا ہے۔ اسی طرح دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تقسیم کی گئی نعمتیں اس عارضی دنیا تک ہی محدود ہیں۔ اس مہربان ربّ نے اپنے بندوں میں سے کچھ کو ان کے حصے کی نعمتوں میں سے دنیا میں زیادہ حصہ دے دیا ہے جبکہ کچھ کا زیادہ حصہ اس ابدی زندگی کے لیے روک لیا ہے۔ آزمائش یہ بھی ہے اور آزمائش وہ بھی ہے‘ البتہ صبر اور شکر شرط ہے۔

(باقی صفحہ 70 پر)

حقیقتِ عملِ صالح

محمد رشید عمر

اس وقت پوری اُمتِ مُسلمہ (اِلّا ماشاء اللہ) کی پستی‘ بے عملی اور لاعلمی کی سطح اس قدر گر چکی ہے کہ اگر یہ اپنے آپ کو عیسائیت‘ یہودیت‘ مشرکوں اور بے خداؤں پر پیش کریں کہ ہمیں بھی اپنے اندر شامل کرلو تو وہ ان کی یہ پیش کش بھی قبول نہ کریں‘ البتہ اپنے اسلحہ کی ہلاکت خیزی کو جانچنے کے لیے بطور تجربہ گاہ بنانے کے لیے تیار ہیں‘ سو وہ کر رہے ہیں۔ اُمّت کے حالات دیکھ کر ﴿اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِھَا ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۹) ’’اللہ تعالیٰ اس کو اس کے مردہ ہونے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟‘‘ کی کیفیت نظر آتی ہے۔

اس دور میں جس طرح محترم ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے دین کے صحیح تصور کو اور سیرتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے انقلابی پہلو کو پیش کر کے احیائی فکر میں جان ڈالی ہے‘ یہ کام مزید کرنے کا ہے۔ خاص طور پر عملِ صالح کیا ہے‘ اس کا صحیح تصور اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کن اعمال کو بطور اعمالِ صالحہ شمار کیا ہے؟ نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ کا ان اعمال کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ انسانی خدمات کے اعمال‘ خاندانی اقدار‘ تعمیرِ سیرت کے لیے دی گئی ہدایات اصل اعمالِ صالحہ بجا لانے میں کیسے معاون اور مدد ثابت ہوتے ہیں؟ اس پہلو کو عوام کے سامنے کھول کر پیش کرنا اس دور کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اصل اعمالِ صالحہ کو اپنائے بغیر اللہ کے حضور پیش ہوئے تو وہاں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس وقت خیر کے چھوٹے چھوٹے اعمال لوگوں کے لیے نشہ کی گولیاں ثابت ہو رہے ہیں اور انہی کے بدلے میں جنتوں کے وارث بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اصل اعمالِ صالحہ جن کو اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر اعمالِ صالحہ کہا ہے‘ ان کو جاننے کے لیے سورۃ التوبہ کی ان آیات کو دیکھیے:

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ مَا کَانَ لِاَھْلِ

الْمَدِیْنَۃِ وَمَنْ حَوْلَھُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ وَلَا یَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِھِمْ عَنْ نَّفْسِہٖ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ لَا یُصِیْبُھُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَۃٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا یَّغِیْظُ الْکُفَّارَ وَلَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا اِلَّا کُتِبَ لَھُمْ بِہٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا یُنْفِقُوْنَ نَفَقَۃً صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً وَّلَا یَقْطَعُوْنَ وَادِیًا اِلَّا کُتِبَ لَھُمْ لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾﴾

’’اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ نہ چاہیے مدینہ والوں کو اور ان کے گرد اَعراب کو کہ پیچھے رہ جائیں رسول اللہ (ﷺ) کا ساتھ دینے میں اور نہ اپنی جان کو چاہیں زیادہ رسولؐ کی جان سے۔ یہ اس واسطے کہ جہاد کرنے والوں کو نہیں پہنچتی پیاس اور نہ محنت اور نہ بھوک اللہ کی راہ میں اور نہیں قدم رکھتے کہیں جس سے خفا ہوں کافر اور نہ چھینتے ہیں دشمن سے کوئی چیز مگر لکھا جاتا ہے ان کے لیے بدلے میں عملِ صالح۔ بے شک اللہ ضائع نہیں کرتا حق نیکی کرنے والوں کا۔ نہ خرچ کرتے ہیں کوئی خرچ چھوٹا نہ بڑا اور نہ طے کرتے ہیں کوئی میدان مگر لکھ لیا جاتا ہے ان کے واسطے تاکہ بدلہ دے ان کو اللہ بہتر اس کام کا جو وہ کرتے ہیں۔‘‘

آیت ۱۱۹ میں دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے: تقویٰ اختیار کرنے کا اور سچوں کا ساتھ دینے کا۔ یہ سچے لوگ اور تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ کون ہیں؟ سورۃ البقرہ میں فرمایا:

﴿وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾﴾

’’اور صبر کرنے والے مشکل میں‘ تکلیف میں اور دورانِ جنگ‘ یہی سچے ہیں اور یہی متقی ہیں۔‘‘

سورۃ الحجرات میں تو جان و مال سے جہادِ مسلسل کو ایمان کی دلیل تسلیم کیا گیا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ (الحجرات)

’’مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) پر‘ پھر شک میں نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے۔ یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔‘‘

اسلام دشمن قوتوں کے خلاف مال و جان سے جہاد کرنا ان کی سچائی کی دلیل ہے۔ جہاد کے دوران کیا کچھ درپیش آتا ہے‘ سورۃ التوبہ کی متذکرہ بالا آیات میں واضح فرمادیا:

(۱) اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے دین کی سربلندی کے مقابلے میں انہیں اپنی جانوں کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔

(۲) ان کے تمام اعمال جیسے سفر کی مشقت‘ بھوک‘ پیاس اور ہر چال جس سے دشمن کو نقصان پہنچتا ہے اور اس پر غلبہ حاصل کر کے مالِ غنیمت کا حصول یہ سب اللہ تعالیٰ ان کے حق میں اعمالِ صالحہ کے طور پر لکھ لیتے ہیں۔ ان مہمات میں لگا ہوا ایک ایک لمحہ ضائع نہیں جاتا۔ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے کیے گئے اخراجات اور اسے گھیرنے کے لیے چلت پھرت سب کو بہترین عملِ صالح کے طور پر ان کے اعمال نامہ میں درج کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اس جہاد کا حکم دیا ہے‘ یہاں تک فرمایا کہ اس نے اس کام کے لیے تمہیں منتخب فرمایا۔

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ (الحج: ۷۸)

’’اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسے جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے۔‘‘

اپنے پیارے نبی ﷺ کو اس کا حکم دیا اور ساتھ میں اہلِ ایمان کو اس کا شوق دلانے کا بھی حکم دیا:

﴿فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ﴾ (النساء: ۸۴)

’’(اے نبی ﷺ!) اللہ کی راہ میں جنگ کیجیے‘ آپ صرف اپنی جان کے مکلف ہیں‘ اور اہلِ ایمان کو شوق دلائیے۔ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ کافروں کی سختی کو ختم کر دے۔‘‘

سورۃ الانفال میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝۶۵﴾

’’اے نبی (ﷺ!) اہلِ ایمان کو (اللہ کی راہ میں) جنگ کرنے کا شوق دلائیے۔ اگر تم میں صبر کرنے والے بیس ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے‘ اور اگر ایسے ڈٹ کر لڑنے والے سو ہوں گے تو وہ ایک ہزار پر غالب آجائیں گے۔‘‘

سورۃ التوبہ میں فرمایا:

﴿قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۴ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ﴾

’’ان کے ساتھ جنگ کریں‘ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے انہیں عذاب دے گا‘ اور انہیں رسوا کرے گا‘ اور ان کے خلاف تمہاری مدد کرے گا‘ اور اہلِ ایمان کے سینوں کو ٹھنڈک عطا فرمائے گا‘ اور ان کے دلوں کے غضب کو دُور کر دے گا۔‘‘

سورۃ التوبہ میں مزید فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۲۳﴾

’’اے اہلِ ایمان! تمہارے قریب جو کُفّار ہیں ان سے جنگ جاری رکھو‘ چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔ اور جان لو اللہ متقین کے ساتھ ہے۔‘‘

کفر کو اسلام کے آگے سرنگوں کرنے کے لیے یہ سارے اعمال و کیفیات اللہ کو راضی کرنے والی ہیں جن کا اجر بطور اعمال صالحہ لکھ لیا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے:

(i) اسلحہ اور جنگی صلاحیت میں برتری

(ii) آپس میں رحیم و شفیق اور دشمن کے مقابلہ میں فولاد کی دیوار

پہلا تقاضا ہے جنگی صلاحیت میں اضافہ۔ فرمایا:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۶۰﴾ (الانفال)

’’پوری استطاعت کے مطابق قوت اور پلے ہوئے گھوڑے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رکھو تاکہ اس کے ذریعے تم اللہ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو ڈراسکو اور سامنے کے دشمنوں کے علاوہ ان کو بھی جن کو تم نہیں جانتے‘ اللہ ان کو جانتا ہے۔ اور اللہ کی راہ میں جو تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تمہارا حق مارا نہیں جائے گا۔‘‘

نبی کریم ﷺ کے مندرجہ ذیل فرمودات ملاحظہ فرمائیے۔ ان تینوں حدیثوں کے راوی حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ مشکاۃ المصابیح‘ کتاب الجہاد میں موجود ہیں۔

(۱) حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں نے رسولِ کریم ﷺ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (الانفال:۶۰) أَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ، أَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ، أَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ‘ ح۴۹۴۶)

’’تم کافروں سے جنگ کے لیے اپنی طاقت وقوت کی جو بھی چیز تیار اور فراہم کر سکتے ہو کرو۔ یاد رکھو تیر اندازی قوت ہے‘ یاد رکھو تیر اندازی قوت ہے۔‘‘

آج کے دور میں تمام قسم کی فائر پاور اس ذیل میں آ جائے گی۔ بندوق کی گولی سے ایٹم بم‘ لیزر اور تمام اقسام کی شعاعوں کا ممکنہ استعمال‘ روبوٹک جنگی صلاحیت سب اس میں شمار ہوگا۔

(۲) ((مَنْ عَلِمَ الرَّمْيَ‘ ثُمَّ تَرَكَهُ فَلَيْسَ مِنَّا، أَوْ قَدْ عَصٰى)) (صحیح مسلم‘کتاب الامارۃ‘ح۴۹۴۹)

’’جس نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا وہ ہم میں سے نہیں۔‘‘ یا فرمایا:’’اُس نے نافرمانی کی۔‘‘

(۳) ((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُدْخِلُ بِالسَّهْمِ الْوَاحِدِ ثَلَاثَةَ نَفَرٍ الْجَنَّةَ: صَانِعَهُ يَحْتَسِبُ فِي صَنْعَتِهِ الْخَيْرَ، وَالرَّامِيَ بِهِ، وَمُنْبِلَهُ)) (سنن النسائی‘ کتاب الخیل‘ ح۳۶۰۸)

’’اللہ تعالیٰ (کُفّار پر چلانے والے) ایک تیر کے بدلے تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرماتا ہے: ایک تو اس تیر کو بنانے والے کو جبکہ وہ اپنے روزگار کے ساتھ ثواب کی امید رکھے (یعنی جب وہ تیر بنائے تو اپنے روزگار کے ساتھ نیت بھی رکھے کہ میں یہ تیر جہاد میں کام آنے کے لیے تیار کر رہا ہوں) دوسرے جہاد میں تیر چلانے والے کو اور تیسرے تیر دینے والے کو۔‘‘

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں اسلحہ میں تیر‘ تلوار اور نیزہ وغیرہ استعمال ہوتا تھا جس کے بنانے‘ چلانے اور چلانا سیکھنے والوں کو آپ ﷺ نے جنت کی بشارت عطا فرمائی۔ کُفّار کے ساتھ جنگ ایک مستقل ذمہ داری تھی‘ جس کے لیے اسلحہ کی بھی ہمہ وقت ضرورت تھی۔ اسلحہ سازی میں وقت کے ساتھ جدّت پیدا ہوگئی۔ مسلمان اس ذمہ داری سے غافل ہوئے تو

اسلحہ سازی کی اہمیت بھی وہ نہ رہی جو ہونی چاہیے تھی۔ یہاں تک کہ کافر قوتیں اس فن میں اتنی آگے بڑھ گئیں کہ ان کا مقابلہ کرنا ہی مشکل ہوگیا۔ اسلحہ سازی کی اہمیت اور جدید فنونِ حرب کی ضرورت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ فرض کریں کہ آج کے کُفّار (یہود ونصاریٰ اور مشرکین) کے پاس جتنا جنگی ساز و سامان ہے‘ اگر یہ کُفّار نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ہوتے تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انسانی سطح پر آپ ﷺ کیا منصوبہ بندی کرتے۔ کفر سے مقابلہ کرنا اعمال کا وہ سلسلہ ہے جو اللہ کی رضا اور جنتوں میں دخول کا سیدھا راستہ ہے۔ اس کے ذریعے ایک کمتر درجے کا مسلمان بھی آخرت میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اہلِ دین ریاضتوں اور باطنی صفائیوں کے کاموں میں گم ہوگئے۔ حکمران اس ذمہ داری سے غافل ہو کر عیاشیوں میں پڑ کر کاہلی اور کم کوشیوں کا شکار ہوگئے۔

تیرہ سال قبل راقم نے ’’مسلمانوں کی تاریخی غلطیاں‘‘ کے نام سے ایک مضمون رقم کیا تھا‘ جس میں عرض کیا گیا تھا کہ اگر مسلمانوں نے جدید اسلحہ سازی اور ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل نہ کی تو جنگ کی صورت میں مسلمانوں کا یک طرفہ ذبح عظیم ہوگا۔ وہ صورتِ حال اس وقت بالکل عیاں ہے۔ اس مضمون کو دوبارہ یہاں ذکر کر رہا ہوں۔

(۱) سائنسی علوم کے حصول اور اس میں ترقی کے بارے میں اہلِ دین کی یکسر خاموشی اور عدم توجہ ہے‘ جس کی وجہ سے شیطانی ٹولے کو بے پناہ قوتِ حرب وضرب حاصل ہوئی۔ جدید ترین اسلحہ کا مقابلہ آج اُمّتِ مُسلمہ کے بس کی بات نظر نہیں آتا۔ گائیڈڈ میزائل جیسے ہتھیاروں سے اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو تباہ کرتا ہے‘ جیسے سورۃ الذاریات میں فرمایا:

﴿قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٣٢﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿٣٣﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣٤﴾﴾

’’ہم مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں‘ تاکہ ان پر ایسے پتھر برسائیں جو مٹی سے تیار کیے گئے ہیں‘ اور ہر پتھر زیادتی کرنے والوں (کو ہلاک کرنے) کے لیے تیرے رب کی طرف سے نشان زدہ کر دیا گیا ہے۔‘‘

یعنی ہر پتھر کو باری تعالیٰ کی طرف سے پروگرام دیا جاتا تھا کہ اس نے کس دشمنِ خدا کو ٹھکانے لگانا ہے۔ آج یہ صلاحیت شیطانی ٹولے نے حاصل کر لی ہے۔

(۲) بے پناہ قوتِ ابلاغ شیطانی ٹولے کو حاصل ہے جبکہ دین کی تبلیغ کا کام اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول ﷺ کو دیا۔ آپ ﷺ نے ہر فردِ اُمّت کی ذمہ داری لگا دی کہ: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً)) ''پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت ہو۔''

آج شیطانی ٹولے کو اپنے نظریات اور پیغام پہنچانے کی جو صلاحیت حاصل ہے' افرادِ اُمّتِ مُسلمہ اس کے سامنے عاجز ہیں۔ سمارٹ فون اور اینڈرائڈ (جنہیں راقم لتر اور تھپڑ کہتا ہے) ہر چھوٹے بڑے' امیر غریب' عالم جاہل کی جیبوں میں ڈال دیے گئے ہیں اور ہم وہ کچھ دیکھنے کے لیے مجبور ہیں جو ہمیں دیکھنا حرام ہے اور وہ کچھ سننے پر مجبور ہیں جو ہمارے لیے ناجائز ہے۔ اس صورت میں ان کا استعمال ایسے ہی ہے جیسے ہمارے منہ پر تھپڑ مارے جا رہے ہیں۔

(۳) تحقیق و ایجاد کے ذریعے شیطانی ٹولا بے تحاشا معاشی فوائد حاصل کر رہا ہے۔ طاقت کے زور پر دنیا کے وسائل لوٹ کر اور اپنی ایجادات کو دنیا میں فروخت کر کے وہ جو بے انتہا معاشی فوائد حاصل کر رہے ہیں' اس سے انہوں نے اپنے معاشروں کو بہترین' فلاحی' مادر پدر آزاد' شیطانی جبکہ اپنے ملکوں کو بہترین شیطانی جنتیں بنا دیا ہے' جہاں ہر کسی کو آزادی اور عزتِ نفس کا ماحول میسر ہے۔ آپ کسی کی بہن یا بیٹی کی عزت خاک میں ملائیں یا مرد ہوتے ہوئے اپنی عزت کسی دوسرے مرد کی شہوتِ نفس کے ہاتھوں پامال کروائیں' کوئی قانون رکاوٹ نہیں بنے گا اور نہ کسی ملامت کا خوف ہوگا۔ اُمّتِ مُسلمہ کے کم ہی افراد ہوں گے جن کے دل میں وہاں کے نظاروں سے لطف حاصل کرنے کی اُمنگ اور تڑپ نہ ہو۔ ان کی اس ترقی کے آگے ہمارے حکمران سجدہ ریز نظر آتے ہیں۔

اس عاجز کر دینے والی برتری نے ہمیں ذلت آمیز مصالحت پر مجبور کیا ہوا ہے' جس کا مظہر یہ ہے کہ ہمارے دانشور اُن کے غلیظ فلسفوں کی جگالی کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا خود نادانستہ ان کی نشر و اشاعت میں لگے رہتے ہیں۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ان کی جدید ایجادات کو خرید کر معاشرے میں اپنے آپ کو اعلیٰ محض اس وجہ سے سمجھتا ہے کہ ان جدید تعیشاتِ زندگی تک اس کو دسترس حاصل ہے۔ اتنی شرم و غیرت نہیں کہ یہ اشیاء کیا اُس نے خود یا اس کے ابنائے ملت نے تیار کی ہیں یا کسی اور نے اس کی جیب کاٹ کر اس کو مہیا کی ہیں۔ ساتھ ہی اس کے دماغ میں تکبر کا خناس بھی بھر دیا گیا ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ ایک اخباری خبر کے

مطابق اہل پاکستان نے تھری جی اور فور جی انٹرنیٹ سہولت سے مستفید ہونے کے لیے ایک سال میں اڑسٹھ ارب روپے خرچ کیے ہیں۔ عوام الناس ان کے عمل کے ثمرات یعنی مکینکل اور الیکٹریکل ایجادات کھول کر جوڑنے کی اکیڈمیاں قائم کرتے رہتے ہیں اور بقیہ ان میں کورسز کر کے روزی کمانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

حل

قرآن و حدیث کی نصوص کی بنیاد پر یہ روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ دین کی سربلندی کی خاطر اس کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کے لیے اسلحہ کی برتری کا حصول اور ایک عادلانہ رحمانی فلاحی معاشرہ قائم کرنا دین کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ تحقیق و ایجاد کی باگ ڈور اُمّتِ مُسلمہ اپنے ہاتھ میں لے۔ اس کام کی اہمیت کی طرف ہمیں مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب ''تجدید و احیائے دین'' میں متوجہ کیا۔ ''اسبابِ ناکامی'' کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں:

''وہاں علم و فن کے محققین' مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے کہ انہوں نے ایک دنیا کی دنیا بدل ڈالی۔''

مناظر احسن گیلانی صاحبؒ اپنی کتاب ''سورۃ الکھف کی تفسیر کے تناظر میں دجالی فتنے کے نمایاں خدوخال'' کے صفحہ ۲۰ پر رقم طراز ہیں:

''میرا مطلب یہ ہے کہ قوانین قدرت پر غیر معمولی اقتدار بجائے خود ایسی چیز نہیں ہے جو آدمی کو دجال بنا دے' بلکہ قرآنی تعلیم کی رو سے تو قدرت کے قوانین سے استفادہ نسلِ انسانی کے مقامِ خلافت کا عام اقتضا ہے۔ آدم کو اسماء کا جو علم بخشا گیا تھا' اسی اجمال کی یہ تفسیر ہے۔''

''تفسیرِ عثمانی'' میں سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۲ پر بڑا معنی خیز تبصرہ موجود ہے:

''معلوم ہوتا ہے جس قسم کے حیرت انگیز کام اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے مادی قوتوں سے کرائے ہیں' اس وقت مخفی اور روحی قوتوں سے کرائے جاتے تھے۔'' (حاشیہ ۳)

علامہ اقبال مرحوم نے ان علوم کے حصول پر کتنا زور دیا ہے' ملاحظہ فرمائیں:

(۱) مولانا گرامی کی خدمت میں لکھتے ہیں:

''مندرجہ ذیل اشعار کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیے۔ مضمون یہ ہے کہ دنیا کی قوتوں کو سمجھنا اور

ان کو قابو میں لانا چاہیے۔ ؎

عالمِ ایجاد لوحِ سادہ نیست
این کہن ساز از نوا افتادہ نیست
برق آہنگ است ہشیارش زنند
خویش را چوں زخمہ بر تارش زنند!

''یہ عالم ایجاد سادہ تختی نہیں ہے۔ پرانا ساز نغموں سے خالی نہیں ہوا‘ برق آہنگ ہے‘ اس لیے اسے ہشیاری سے بجاتے ہیں۔ خود کو مضراب کی طرح اس کے تاروں پر مارتے ہیں۔'' (مکاتیبِ اقبال‘ ج ا‘ ص ۵۸۵‘ مولانا گرامی کے نام خط)

(۲) خواجہ غلام السیدین کے نام پورا خط ہی اس موضوع پر ہے۔ لکھتے ہیں:

''علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ میں آتی ہے‘ جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو شیطانیت ہے۔ یہ علم حق کی ابتدا ہے‘ جیسے میں نے ''جاوید نامہ'' میں لکھا ہے: ؎

علمِ حق اوّل حواس آخر حضور
آخرِ او می نگنجد در شعور!

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا جو علم حق کی آخری منزل ہے‘ اس کا دوسرا نام عشق ہے۔
علم و عشق کے تعلق میں ''جاوید نامہ'' میں کئی اشعار ہیں۔ ؎

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں!

مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان کرے۔ بولہب را حیدرِ کرار کن! اگر یہ بولہب حیدرِ کرار بن جائے‘ یا یوں کہیے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوعِ انسانی کے لیے سراسر رحمت ہے۔'' (مکاتیبِ اقبال‘ ج ۴‘ ص ۳۲۴)

(۳) چودھری حسین کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن تجربے اور مشاہدہ کی طرف بار بار اپیل کرتا ہے اور

نظامِ عالم کی قوائے تسخیر پر مومن کو آمادہ کرتا ہے۔'' (مکاتیبِ اقبال‘ ج ۴‘ ص ۱۰۲۲)

علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں معلوم نہیں کتنی بار جہانِ نو کی تعمیر کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اسی روز و شب میں اُلجھ کر رہ جانے کی بجائے نئے صبح و شام‘ نئے زمان و مکاں پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ ان کے اشعار پر سر دھننے والے ان کے پیغامِ عمل کو جو بے تحاشا محنت کا متقاضی ہے‘ جس سے جنت ابدی وجود میں آتی ہے‘ نظر انداز کر رہے ہیں۔ ؎

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد‘ گفتند کہ برہم زن!

یعنی نئے سرے سے توحید اور سنت پر مبنی نظام پر چلنے والے جہان کی تعمیر کرو۔

غلبۂ دین کے لیے جہاد فی سبیل اللہ میں برابر کی قوت کے حصول کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینا اُمّتِ مُسلمہ کا فریضہ ہے۔ اس کے لیے علماء دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے حصول کی اہمیت مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے سامنے رکھیں۔ حکمت لقمان کی روشنی میں دانش مسلم کو بروئے کار لانے کی ترغیب دیں۔ ٹیکنالوجی میں ترقی بلکہ یورپ سے آگے نکل جانے کے لیے تسخیرِ مادہ کی اہمیت اُجاگر کریں۔ اس میدان میں محنت کرنے والوں کو اعلیٰ اجر و ثواب کی بشارتیں دیں۔ علومِ عقلیہ کی حوصلہ افزائی اس قدر کریں کہ دنیاوی تعلیم کے معلّمین اور متعلّمین کے دل ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے غیرت سے بھر دیں اور اس میدان میں مسلم سوادِ اعظم کو نظریے کی بنیاد پر عالمِ کفر سے برسرِ پیکار کر دیں۔ اس تصادم سے دینی تعلیم اور تزکیہ کی اہمیت اُبھر کر سامنے آئے گی اور اللہ اور رسول ﷺ کی پیروی باعثِ عزت و افتخار بن جائے گی۔ آج مدرسہ اور سکول میں جو مغایرت ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی اور یہ بات واضح ہو جائے گی کہ علمائے دین نے نماز‘ روزہ اور قرآن و سنت کو محض اپنی ڈھال نہیں بنایا۔ انہیں ملّتِ اسلامیہ کی حربی قوت‘ معاشی برتری اور عادلانہ فلاحی رحمانی معاشرے کے قیام کی جِدّ و جُہد کا انشراح حاصل ہے۔ وہ ایک واضح ہدایت نامہ بھی قوم کے سامنے رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں‘ جو قرآن و سُنّت پر عمل کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

مزید برآں:

(۱) ہم اپنے سائنس دانوں اور تحقیق کاروں کو اسلامی اخلاقیات کے زیور سے آراستہ کریں۔

(۲) تحقیق و ایجاد میں یہود و نصاریٰ کو شکست دینے کے لیے ہماری رہنمائی کے لیے دنیا کی بہترین کتاب (قرآن مجید) موجود ہے مگر علم کے حوالے سے ہم ساری دنیا سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ آج تمام ایجادات اور دریافتیں مسلمانوں کی بجائے دوسری قومیں کر رہی ہیں۔ ہماری کتاب کی ایک ایک آیت کے ترجمہ وتفسیر پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان کی تحقیق اور ریسرچ کے ذریعے نہ صرف دنیا بلکہ پوری کائنات میں انقلاب لایا جاسکتا ہے۔

(۳) تحقیق و ایجاد کی دوڑ میں برتری حاصل کرنے کا کام انتہائی کٹھن اور محنت طلب ہے۔ اس راہ میں اُمتِ مُسلمہ کے لیے اتنی ہی مشکلات ہیں جتنا دین کو بالفعل دنیا پر غالب کرنے کی جدوجہد میں درپیش ہیں۔ چنانچہ اس کے لیے:

(i) ہمارے سائنس دانوں اور تحقیق کاروں کو اب تک کی ترقی کو سیڑھی کے طور پر اسی طرح استعمال کرنا چاہیے جیسے ان اقوام کے زیرک افراد نے مسلمانوں کی ترقی کو بطور سیڑھی استعمال کیا تھا۔

(ii) اپنے منصوبوں کو صیغۂ راز میں رکھا جائے۔

(iii) مالی ضرورتوں کے لیے مسلمانوں کے جذبہ انفاق کو استعمال کر کے ایک بڑا ترقیاتی بیت المال قائم کیا جائے۔ تحقیقی کارکنوں کو اسلام کے دائرۂ اخلاق میں رہتے ہوئے زندگی کی سہولتیں اعلیٰ معیار پر فراہم کی جائیں۔

دوسرا تقاضا یہ ہے کہ کفر سے نبرد آزما مجاہدین کے پیچھے پوری اُمّت ایک وحدت کی شکل میں کھڑی ہو۔ باہم رحیم وشفیق اور دشمن کے خلاف انتہائی سخت۔ اللہ تعالیٰ کا یہی منشا ہے جس کو باری تعالیٰ نے سورۃ الفتح میں فرمایا:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ډ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۾ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۲۹﴾ (الفتح)

”محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں‘ اور ان کے ساتھ والے کافروں پر سخت‘ آپس میں نرم دل ہیں۔ تم انہیں رکوع کرتے ہوئے سجدہ کرتے ہوئے دیکھو گے‘ اللہ کا فضل و رضا چاہتے ہیں۔ ان کی علامت ان کے چہروں میں سجدوں کے نشان سے ہے۔ یہ ان کی صفت تورات میں (مذکور) ہے‘ اور ان کی صفت انجیل میں (مذکور) ہے جیسے ایک کھیتی ہو جس نے اپنی باریک سی کونپل نکالی‘ پھر اسے طاقت دی‘ پھر وہ موٹی ہوگئی‘ پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی‘ کسانوں کو اچھی لگتی ہے (اللہ نے مسلمانوں کی یہ شان اس لیے بڑھائی) تاکہ ان سے کافروں کے دل جلائے۔ اللہ نے ان میں سے ایمان والوں اور اعمالِ صالحہ کرنے والوں سے بخشش اور بڑے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔“

سورۃ المائدۃ میں تو یہ بات اس وعید کے ساتھ فرمائی کہ اگر تم یہ اوصاف نہیں اپناؤ گے تو اللہ تعالیٰ کسی اور قوم سے یہ کام لے لے گا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۵۴﴾

”اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب اللہ ایسی قوم کو لائے گا کہ جن سے اللہ محبت رکھتا ہے اور وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں‘ مسلمانوں پر نرم دل ہوں گے اور کافروں پر زبردست‘ اللہ کی راہ میں لڑیں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دیتا ہے‘ اور اللہ کشائش والا جاننے والا ہے۔“

چنانچہ دینِ اسلام کے عقائد ونظریات‘ نظامِ عبادت اور نظامِ اخلاق و معاملات کے مقاصد میں جہاں اولین مقصد اللہ کی رضا‘ انسانیت کا روحانی ترفع یعنی انسان کے اندر ملکوتی صفات پیدا کرنا ہے وہاں یہ سب کچھ تمام اُمت میں وحدت‘ مروت اور شفقت پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہے اور ان کو بطور پیکج اختیار کرنے کا حکم ہے۔ ان میں سے کسی ایک میں بھی اپنی طرف سے کمی یا زیادتی سخت سزا اور عذاب کا مستحق بنا دیتی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبہ جات کے لیے ہدایات جن کا اتباع امت کو مقام بلند پر قائم رکھ سکتا ہے اس کو ہم اجتماعی عمل بنانے سے غافل ہو چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات کسی بھی خطے میں اجتماعیت پر نافذ نہیں ہیں۔

رنگ ونسل‘ زبانوں کا اختلاف‘ مختلف علاقوں میں ان کی موجودگی جو اللہ کی نشانیوں میں سے اورصرف پہچان کا ذریعہ تھی انہی کی بنیاد پر آج اُمت ۵۸ قطعات میں بٹ چکی ہے اوراس فرمان کی تصویر بنی ہوئی ہے:

﴿وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۱۶۸﴾ (الاعراف)

’’اورمتفرق کر دیا ہم نے ان کو زمین میں فرقے فرقے‘ ان میں سے کچھ نیک تھے اور کچھ اس کے علاوہ تھے۔ اورہم نے اچھے حالات اور برے حالات کے ساتھ ان کی آزمائش کی کہ شاید وہ باز آجائیں۔‘‘

آج مصریوں کو سوڈانیوں سے کوئی غرض نہیں‘ سعودیوں‘ اُردنیوں‘ اہلِ امارات کو فلسطینیوں سے کوئی غرض نہیں‘ پاکستانیوں کو افغانیوں سے کچھ لینا دینا نہیں۔ پوری اُمت کا یہی حال ہے۔ الگ الگ ہو کر دشمن کے لیے تر نوالہ بنے ہوئے ہیں بلکہ ذلت آمیز طریقے سے ان کے ساتھ مصالحت کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ ایک ملک کے باشندے قومیتوں کی بنیاد پر ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہیں۔ عبادات سے متعلق اختلافِ رائے نے لوگوں کو فرقوں میں بانٹا ہوا ہے۔ زبوں حالی کی کیفیت اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔ یہودی بنوقریظہ کے قتل کا بدلہ فلسطینیوں سے مسلسل لے رہے ہیں۔ پوری اُمت کے اندر سکت نہیں کہ بھوکے پیاسے فلسطینی کو ایک گلاس پانی یا دو لقمے خوراک کے اپنی مرضی سے فراہم کر سکے۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ مسلمان ملکوں میں سے کسی بھی ملک کے ساتھ وہ ایسا سلوک کرنا شروع کر دیں تو وہ اپنا دفاع نہیں کرسکتا۔ جس نظام کی بنیاد احتساب پر تھی اس کے ماننے والوں کی معاشرتی‘ معاشی اور سیاسی حالت کسی قاعدے کلیے کی پابند نہیں رہی۔ معصیت اور سرکشی کے ذرائع آسان اور وافر مقدار میں ہر فرد کو میسر ہیں۔ حکمران طبقات ان اُمور کی قیادت کر رہے ہیں۔ اصلاح کی ڈور کا سرا ہاتھ آئے تو کیسے آئے! حضرت ابو ہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

’’انسانی زندگی میں بہترین زندگی اس شخص کی ہے جو اللہ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی باگ پکڑ لے اور جب کسی کی خوف زدہ آواز یا کسی کے فریاد کرنے کی آواز سنے تو عجلت کے ساتھ گھوڑے کی پشت پر سوار ہو جائے اور اس خوف زدہ آواز کی طرف دوڑتا ہوا چلا

جائے اور اپنی موت یا اس جگہ کو تلاش کرتا پھرے جہاں موت کا گمان ہو (یعنی جب وہ کسی خوف زدہ کی چیخ و پکار یا فریاد اور مدد چاہنے والے کی آواز سنے تو عجلت کے ساتھ چل پڑے اور اس آواز کو تلاش کرتا پھرے تا کہ موقع پر پہنچ کر فریاد کرنے والے کی مدد کرے‘ اور اس بات سے نہ ڈرے کہ کہیں میری جان پر نہ بن جائے اور مجھے اپنی زندگی سے ہی ہاتھ دھونے پڑ جائیں) یا بہترین زندگی اس شخص کی ہے جو کچھ بکریوں کے ساتھ ان پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کی چوٹی پر یا ان وادیوں میں سے کسی وادی میں پناہ گزیں ہے‘ نماز پڑھتا ہے‘ زکوٰۃ دیتا ہے اور پروردگار کی عبادت میں مشغول رہتا ہے یہاں تک کہ اس کو موت آجائے۔ یہ شخص انسانوں کا شریک نہیں بلکہ صرف بھلائی کے درمیان زندگی بسر کرتا ہے۔‘‘ (صحیح مسلم‘ بحوالہ مشکوٰۃ)

حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص دنیا والوں سے الگ تھلگ رہ کر ان کی برائیوں اور ان کے فتنہ وشر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے اور اپنے فتنہ وشر سے دنیا والوں کو بچاتا ہے۔ اس حدیث کا حاصل دراصل دشمنانِ اسلام کے مقابلہ پر جہاد کے لیے اپنے نفس و شیطان سے مجاہدہ اور دنیا کی فانی لذتوں اور نفس کی باطل خواہشات وشہوات سے اجتناب کی طرف راغب کرتا ہے۔ نیز اس بات کی آگاہی دیتا ہے کہ اگر دین کی تائید اور شریعت کی تقویت کے لیے لوگوں کے درمیان رہن سہن اختیار کرے تو بہتر ہے‘ ورنہ گوشۂ عافیت اختیار کرے۔ (یہ تشریح مشکوٰۃ سے ماخوذ ہے)

دنیا سے الگ تھلگ رہ کر نماز‘ روزے کا اس درجہ کا پابند رہنا کہ انسان جنت کا مستحق بن جائے‘ اتنا ہی مشکل ہے جتنا جہاد فی سبیل اللہ میں دین کی سربلندی کے لیے تن من دھن لگا دینا۔ البتہ خلوص نیت سے جہاد فی سبیل اللہ دین کی‘ فرد کی‘ اُمت کی سرفرازی اور سربلندی کا وہ راستہ ہے جس میں محض رات کے وقت حفاظتی پہرا دینے والا جو شہید ہو جائے‘ اللہ کے نزدیک بلند درجات کا مستحق اور مرنے کے بعد بھی اپنے عمل کا اجر پانے والا بن جاتا ہے جبکہ جنگ کے دوران شہید ہونے والوں کی زندگی کا تو ہمیں شعور ہی نہیں۔ اللہ کی رضا اور جنتوں کے حصول کے سیدھے راستے کو چھوڑ کر ہم بھول بھلیوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ہمیں جہاد فی سبیل اللہ کی طرف لوٹنا ہوگا۔ منصبِ خلافت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا وعدہ جو سورۃ النور میں کیا گیا ہے وہ انہی اعمالِ صالحہ کا مرہونِ منّت ہے۔ فرمایا گیا:

﴿وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۪ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ وَ لَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ وَ مَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۵۵﴾﴾

’’اللہ نے وعدہ کر لیا تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالحہ اختیار کیے کہ بلاشبہ وہ انہیں زمین میں ضرور خلافت عطا فرمائے گا جس طرح ان لوگوں کو خلافت عطا کی جو ان سے پہلے تھے۔ اور یقیناً وہ ان کے دین کو اقتدار بخشے گا جو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے اور یقیناً ان کی خوف کی حالت کو امن میں بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے‘ میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے گا تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔‘‘

اعمالِ صالحہ کے ثمرات سمیٹنے والوں کے لیے مزید دو چیزوں کی ضرورت ہے: (۱) تربیتی نصاب (۲) جنگی اخلاقیات کی تعلیم جس کی رہنمائی قرآن و حدیث میں دی گئی ہے۔ تربیتی نصاب سورۃ الجمعہ‘ سورۂ آل عمران‘ سورۃ البقرۃ میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ الجمعہ کی تین آیات کا مضمون پیش خدمت ہے:

﴿ہُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ٭ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲﴾ وَّ اٰخَرِیۡنَ مِنۡہُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۳﴾ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۴﴾﴾

’’وہی تو ہے جس نے اُمّیّین میں ایک رسول مبعوث فرمایا ان ہی میں سے‘ جو اُن کو اُس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے‘ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور بلاشبہ اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں تھے۔ اور ان ہی میں سے اُن دوسرے لوگوں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔ اور وہ زبردست ہے‘ کمال حکمت والا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے‘ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔‘‘

جو لوگ اس تربیتی نصاب کے بغیر علوم و فنون میں آگے بڑھتے ہیں ان کے علوم و فنون کے طوماروں کی مثال ایسے ہی ہے جیسے گدھوں پر کتابیں لادی ہوں اور وہ ان سے استفادہ نہیں کر سکتے‘ وہ گدھے ہی رہتے ہیں۔ آج انسانی معاشرے اس کی مثال بنے ہوئے ہیں۔

اسی تربیتی نصاب کی برکات ہیں کہ عین اس معرکۂ حق و باطل میں جہاں ایک طرف گردنیں کٹ کٹ کر گر رہی ہوں‘ سینے چیرے جا رہے ہوں یہ مردانِ خدا اعلیٰ جنگی اخلاق پر قائم ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے ان کی مدد فرماتا ہے۔ جنگی اخلاق کی ایک مثال سورۃ الانفال میں بیان فرمائی:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا لَقِیۡتُمۡ فِئَۃً فَاثۡبُتُوۡا وَ اذۡکُرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا لَّعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۴۵﴾ وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ لَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَ تَذۡہَبَ رِیۡحُکُمۡ وَ اصۡبِرُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۴۶﴾﴾

’’اے ایمان والو! جب تمہارا ٹکراؤ کسی (دشمن) گروہ سے ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور آپس میں تنازع کھڑا نہ کرو‘ ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ میدانِ جنگ میں ڈٹ کر رہو۔ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔‘‘

سورۃ الانفال میں ایک جگہ پھر فرمایا:

﴿اِذۡ یُوۡحِیۡ رَبُّکَ اِلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیۡ مَعَکُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ سَاُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الرُّعۡبَ فَاضۡرِبُوۡا فَوۡقَ الۡاَعۡنَاقِ وَ اضۡرِبُوۡا مِنۡہُمۡ کُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾﴾

’’جب آپ کا ربّ فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں‘ پس تم اہلِ ایمان (کے دلوں) کو ثابت قدم رکھو۔ میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا‘ سو ان کی گردنوں پر (تلوار) مارو اور ان کے جوڑ جوڑ الگ کر دو۔‘‘ ❀❀❀

بقیہ: جاہلیتِ جدیدہ کے خلاف جہاد بالقرآن

اگر اس جاہلیتِ جدیدہ اور اس کی مغلطات کا مقابلہ کرنا ہے تو علوم قرآنی کے حصول کے لیے وقت لگانا ہوگا۔ پھر ان علوم کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کرنا ہوگا۔ اس بات پر خود بھی ایمان لانا ہوگا کہ قرآن صرف حصولِ ثواب کے لیے نازل نہیں کیا گیا بلکہ قیامت تک آنے والے تمام طاغوتی نظریات و افکار اور اغیار کی تمام تر سازشوں کا منہ توڑ جواب اسی قرآن میں موجود ہے۔ یہ قرآن ہی ہے جو منبع ایمان تھا‘ ہے اور رہے گا!

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس جاہلیتِ جدیدہ کے خلاف صحیح معنوں میں جہاد بذریعہ قرآن کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین! ❀❀❀

حج کے روحانی ثمرات

احمد علی محمودی

حج اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ یہ ایک مقدس اور عظیم عبادت ہے جو ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض ہے۔ حج ہر سال ذوالحجہ کے مہینے میں مکہ مکرمہ میں ادا کیا جاتا ہے۔ یہ محض جسمانی سفر نہیں‘ بلکہ ایک روحانی اور قلبی تجدید کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ انسان کے دل و دماغ‘ روح اور زندگی میں مکمل تبدیلی کا پیغام ہے۔ جب ایک مسلمان احرام باندھ کر خانہ کعبہ کی طرف روانہ ہوتا ہے‘ تو اُس کا دل صرف اللہ کی رضا کے لیے دھڑکنے لگتا ہے اور وہ دنیاوی تعلقات‘ جاہ وغرور‘ مال ودولت اور اپنی ذات کی تمام ترجیحات کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ حج ہمیں عاجزی‘ اتحاد‘ قربانی اور اطاعت کا سبق دیتا ہے۔ عرفات کا میدان انسان کو اُس کے گناہوں کا احساس دلاتا ہے اور توبہ کے آنسو بہا کر اُسے ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ منیٰ کی وادی میں شیطان کو کنکریاں مار کر ہم اپنی زندگی کے شیطانی وسوسوں کو رد کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ یہ سفر دراصل ایک نئے انسان کی پیدائش کا عمل ہے جو اللہ سے قریب تر ہو‘ اپنے نفس کو پہچان چکا ہو‘ اور دنیا میں امن‘ محبت اور نیکی کا پیغام بر ہو۔ حج کے ذریعے ایک مسلمان کی روح پاکیزگی اور قربِ الٰہی کے ایک منفرد تجربے سے گزرتی ہے۔

تقویٰ اور صبر کی تربیت

حج ایک عظیم عبادت ہے جو نہ صرف جسمانی مشقت کا تقاضا کرتی ہے بلکہ روحانی تزکیہ اور اخلاقی تربیت کا بھی ذریعہ بنتی ہے۔ حج کے مختلف مراحل انسان کو تقویٰ (اللہ کا ڈر اور اطاعت) اور صبر (برداشت اور استقامت) سکھاتے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ (البقرہ:۱۹۷)

’’اور (حج کے سفر میں) زادِراہ ساتھ لے لیا کرو‘ پس یقیناً بہترین زادِراہ تقویٰ ہے۔‘‘

حج ایک ایسا سفر ہے جو صبر‘ ایثار اور تقویٰ کی حقیقی آزمائش ہے۔ جب حاجی احرام باندھتا ہے تو وہ بہت سے جائز کاموں سے بھی رک جاتا ہے۔ یہ تقویٰ کی علامت ہے کہ انسان اللہ کی رضا کے لیے اپنے نفس کی خواہشات کو قابو میں رکھے۔ ہر حاجی ’’لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ‘‘ کہہ کر اللہ کے حکم کے سامنے سرِتسلیم خم کرتا ہے‘ جو کہ تقویٰ کا کامل مظہر ہے۔ مناسکِ حج (طواف‘ سعی‘ وقوفِ عرفہ‘ رمی جمار اور قربانی وغیرہ) صرف اللہ کی رضا کے لیے کیے جاتے ہیں‘ جو انسان کو اخلاص‘ خوفِ خدا اور پرہیزگاری کی طرف لے جاتے ہیں۔ حج کے دوران کئی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے‘ جیسے ہجوم‘ تھکن‘ موسم کی شدت اور محدود سہولیات۔ ان حالات میں حاجی کو صبر کا دامن تھامنا پڑتا ہے اور اللہ کی رضا پر راضی رہنا ہوتا ہے۔ یہی صبر اور برداشت حاجی کی روح کو مضبوط بناتے ہیں اور اُسے عملی زندگی میں مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ صفا ومروہ کی سعی سے حاجی حضرت ہاجرہؑ کی قربانی کو یاد کر کے صبر وتوکل سیکھتا ہے۔ وقوفِ عرفات میں دھوپ میں کھڑے ہو کر دعائیں مانگنا صبر وعاجزی کی بہترین مثال ہے۔ حج انسان کو سکھاتا ہے کہ زندگی میں اللہ کی رضا کے لیے تقویٰ اور صبر کے ساتھ چلنا چاہیے۔ یہی صفات ایک مسلمان کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔

اللہ کی قربت اور ایمان میں اضافہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِيْمَانٌ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ)) قِيْلَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: ((اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))‘ قِيْلَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: ((حَجٌّ مَبْرُوْرٌ)) (صحیح مسلم:۲۴۸)

’’اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لانا۔‘‘ کہا گیا: اس کے بعد کون سا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔‘‘ کہا گیا: پھر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’حج مبرور۔‘‘

حج ایک ایسا عمل ہے جو بندے کو براہِ راست اللہ کے قریب کر دیتا ہے۔ حج کے مناسک بندے کو دنیاوی خواہشات سے دور کر کے مکمل طور پر اللہ کے سامنے جھکنے کی تربیت دیتے ہیں۔ جب ایک مومن احرام باندھ کر دنیاوی وابستگیوں کو چھوڑ دیتا ہے اور لبیک کی صدا بلند کرتا ہے تو درحقیقت وہ دنیا کی ظاہری زیب وزینت کو چھوڑ کر صرف اپنے رب کی رضا کے لیے نکلتا

ہے۔طوافِ کعبہ‘ عرفات میں دعا‘ مزدلفہ میں قیام‘ جمرات کی رمی اور قربانی یہ سب اعمال روح کو پاکیزہ اور انسان کے دل میں اللہ کی محبت کو مزید پختہ اور اس کے ایمان کو تروتازہ کر دیتے ہیں۔ خانہ کعبہ کے طواف سے صفا ومروہ کی سعی تک‘ ہر لمحہ بندے کو اپنے رب کی یاد دلاتا ہے۔ جب بندہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے دروازے اُس پر کھول دیتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب ایمان میں اضافہ محسوس ہوتا ہے‘ دل نرم ہوتا ہے اور آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔ حج انسان کو اس کی اصل فطرت یعنی بندگی کی طرف واپس لے آتا ہے۔ اس سفر کے بعد انسان کا دل اللہ کی محبت سے لبریز ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی میں ایک روحانی انقلاب آتا ہے۔

گناہوں کی معافی اور روحانی پاکیزگی

جو بندہ خلوصِ نیت اور صحیح طریقے سے حج ادا کرتا ہے‘ اس کے لیے یہ گناہوں کی معافی اور روحانی پاکیزگی کا بھی بہترین ذریعہ ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ))(صحيح البخاري)

’’جس نے اللہ کے لیے حج کیا اور اس دوران فحش بات اور گناہ نہ کیا‘ وہ (حج کے بعد) ایسا لوٹے گا جیسے اُس کی ماں نے اُسے ابھی جنا ہو۔‘‘

یعنی حج گناہوں کو ایسے دھو دیتا ہے جیسے وہ کبھی کیے ہی نہ ہوں۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ))(متفق عليه)

’’ایک عمرہ دوسرے عمرے تک گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کا بدلہ صرف جنت ہے۔‘‘

سیدنا عمرو بن العاص ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ)) (صحيح مسلم:٣٢١)

’’بلاشبہ حج کی ادائیگی سے سابقہ گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔‘‘

درج بالا احادیث اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ حج ایک ایسی عبادت ہے جو بندے

کے سابقہ گناہوں کو مٹا کر اسے نئی زندگی عطا کرتی ہے۔ انسان جب اپنی سابقہ خطاؤں سے توبہ کرتا ہے اور اللہ کے حضور اپنی اصلاح کا عہد کرتا ہے‘ تو اُس کی روح گناہوں کے بوجھ سے آزاد ہو کر ہلکی اور پاکیزہ ہو جاتی ہے۔

فقر سے نجات

اللہ تعالیٰ حج کی برکت سے بندے کی تنگ دستی ختم کر دیتا ہے اور اُس کے رزق میں برکت عطا فرماتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((تَابِعُوا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوبَ كَمَا يَنْفِي الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَلَيْسَ لِلْحَجَّةِ الْمَبْرُورَةِ ثَوَابٌ إِلَّا الْجَنَّةُ)) (سنن الترمذی:٨١٠)

’’حج اور عمرہ ایک کے بعد دوسرا ادا کرو‘ اس لیے کہ یہ دونوں فقر اور گناہوں کو اس طرح مٹا دیتے ہیں جیسے بھٹی لوہے‘ سونے اور چاندی کے میل کو مٹا دیتی ہے۔ اور حج مبرور کا بدلہ صرف جنت ہے۔‘‘

اللہ کے مہمان

’’حجّاج اللہ کے مہمان‘‘ ایک نہایت خوب صورت اور بامعنی جملہ ہے جو حج پر جانے والے مسلمانوں کی عظمت اور مرتبے کو بیان کرتا ہے۔ اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان حج کے لیے جاتے ہیں‘ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے مہمان ہوتے ہیں‘ اور اُن کی میزبانی اللہ تعالیٰ خود کرتا ہے۔ سیدنا ابن عمر ؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((الْغَازِي فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْحَاجُّ وَالْمُعْتَمِرُ وَفْدُ اللّٰهِ، دَعَاهُمْ فَأَجَابُوهُ، وَسَأَلُوهُ فَأَعْطَاهُمْ)) (سنن ابن ماجه:٢٨٩٣)

’’اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے‘ حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بلایا تو انہوں نے حاضری دی‘ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مانگا تو اُس نے اُنہیں عطا کیا۔‘‘

اللہ کی ضمانت

حاجی اللہ تعالیٰ کی ضمانت میں ہوتا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ

نے ارشاد فرمایا:

((ثَلَاثَةٌ فِي ضَمَانِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ: رَجُلٌ خَرَجَ إِلٰى مَسْجِدٍ مِنْ مَسَاجِدِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ، وَرَجُلٌ خَرَجَ غَازِيًا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، وَرَجُلٌ خَرَجَ حَاجًّا)) (السلسلة الصحيحة للالبانی:۲۰۹)

''تین شخص اللہ کی ضمانت میں ہیں: وہ شخص جو اللہ کی مساجد میں سے کسی مسجد کی طرف نکلا‘ اور وہ شخص جو اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے نکلا اور وہ شخص جو حج کرنے کے لیے نکلا۔''

(۷) سفرِ حج میں موت

بندہ جب سفرِ حج پر نکلتا ہے اور اسی سفر میں وہ فوت ہو جاتا ہے تو قیامت تک اُس کے حق میں حج کا اجر وثواب لکھا جاتا رہے گا۔ سیدنا ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ خَرَجَ حَاجًّا فَمَاتَ كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ أَجْرَ الْحَاجِّ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ خَرَجَ مُعْتَمِرًا فَمَاتَ كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ أَجْرَ الْمُعْتَمِرِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ خَرَجَ غَازِيًا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَمَاتَ كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ أَجْرَ الْغَازِي إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ)) (المعجم الكبير للطبرانی:۸۰)

''جو شخص حج کرنے کے ارادے سے نکلا اور فوت ہو گیا‘ قیامت تک اُس کے لیے حج کرنے والے کا ثواب لکھا جائے گا‘ اور جو شخص عمرہ کرنے کے لیے نکلا اور وفات پا گیا‘ قیامت تک اُس کے لیے عمرہ کرنے کا ثواب لکھا جائے گا‘ اور جو شخص اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے لیے نکلا اور وفات پا گیا تو قیامت تک اُس کے لیے مجاہد کا اجر وثواب لکھا جائے گا۔''

وہ کتنا خوش نصیب انسان ہے کہ اگر دورانِ حج یا سفرِ حج میں وفات پا گیا تو روزِ محشر باری تعالیٰ کے ہاں تلبیہ کہتے ہوئے حاضر ہوگا۔ سیدنا ابن عباس ؓ سے مروی ہے ایک شخص میدانِ عرفہ میں (احرام باندھے ہوئے) کھڑا ہوا تھا کہ اچانک اپنی سواری سے گر پڑا اور سواری نے اُسے کچل دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اغْسِلُوهُ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ وَكَفِّنُوهُ فِي ثَوْبَيْنِ، وَلَا تُحَنِّطُوهُ وَلَا تُخَمِّرُوا رَأْسَهُ، فَإِنَّهُ يُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُلَبِّيًا)) (صحيح البخاري:۱۲۶۵)

''پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دے کر دو کپڑوں میں اسے کفن دو اور یہ بھی ہدایت فرمائی کہ اسے خوشبو نہ لگاؤ اور نہ اس کا سر چھپاؤ‘ کیونکہ یہ قیامت کے دن تلبیہ کہتا ہوا اٹھے گا۔''

حج کے بدلے جنت

اللہ عزوجل حج کے بدلے جنت عطا فرماتا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل ؓ سے روایت ہے‘ وہ فرماتے ہیں:

كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي سَفَرٍ، فَأَصْبَحْتُ يَوْمًا قَرِيبًا مِنْهُ وَنَحْنُ نَسِيرُ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَخْبِرْنِي بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدُنِي عَنِ النَّارِ، قَالَ :((لَقَدْ سَأَلْتَنِي عَنْ عَظِيمٍ، وَإِنَّهُ لَيَسِيرٌ عَلٰى مَنْ يَسَّرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ، تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكْ بِهِ شَيْئًا، وَتُقِيمُ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ، وَتَصُومُ رَمَضَانَ، وَتَحُجُّ الْبَيْتَ)) (سنن الترمذي:۲۶۱۶)

''مَیں ایک سفر میں اللہ کے نبی ﷺ کے ساتھ تھا۔ ایک دن میں چلتے ہوئے آپ سے قریب ہو گیا تو عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے‘ جو مجھے جنت میں لے جائے اور جہنم سے دور رکھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے ایک بہت بڑی بات پوچھی ہے اور بے شک یہ عمل اُس شخص کے لیے آسان ہے‘ جس کے لیے اللہ آسان کر دے۔ تم اللہ کی عبادت کرو اور اُس کا کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ‘ نماز قائم کرو‘ زکوٰۃ دو‘ رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو۔''

حج سے محروم‘ خیر سے محروم

جو لوگ صاحبِ ثروت ہیں اُنہیں چاہیے کہ حج کریں‘ کیوں کہ جو حج کی بھلائیوں سے محروم ہو گیا وہ خیر سے محروم ہو گیا‘ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ يقول: إنَّ عبدًا اصححتُ لهُ جِسْمَهُ، ووسّعتُ عليه في المعيشة، تمضي عليه خمسة اعوام لا يفد إليَّ لمحروم)) (السلسلة الصحيحة للالبانی:۱۶۶۲)

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: مَیں نے اپنے بندے کا جسم تندرست رکھا‘ اُس کی معیشت میں وسعت پیدا کی‘ لیکن اس حالت میں پانچ سال بیت گئے اور وہ میری طرف (حج کے

لیے) نہیں آیا‘ ایسا آدمی محروم ہے۔‘‘

یہ حدیث سیدنا ابوسعید اور سیدنا ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے۔

مساوات اور اخوت کا درس

حج کے دوران تمام حاجی ایک ہی لباس (احرام) پہنتے ہیں‘ جو کہ دو غیر سلے ہوئے سفید کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ نہ کوئی امیر ہوتا ہے‘ نہ غریب‘ نہ بادشاہ‘ نہ فقیر‘ سب ایک جیسے کپڑوں میں‘ ایک ہی جگہ‘ ایک جیسے اعمال سرانجام دیتے ہیں۔ حج ہمیں سکھاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان کی قدر و قیمت اُس کے تقویٰ سے ہے‘ نہ کہ مال و دولت یا رنگ و نسل سے۔ دنیا بھر سے مسلمان حج کے لیے آتے ہیں‘ مختلف زبانیں بولنے والے‘ مختلف رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے‘ لیکن ایک ہی قبلہ کی طرف رخ کیے‘ ایک ہی دعا مانگتے ہیں۔ اس اجتماع میں کوئی اجنبیت نہیں‘ سب ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ یہ منظر عملی طور پر اُمتِ مُسلمہ میں اخوت‘ محبت اور اتحاد کا مظہر ہے۔ حج ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم ایک اُمت ہیں‘ اور ہمارا رب ایک ہے‘ قبلہ ایک ہے‘ اور دین ایک ہے۔ اختلافات کو چھوڑ کر ہم اللہ کے حضور ایک ہو جاتے ہیں۔ حج ہمیں صرف عبادات کا طریقہ ہی نہیں سکھاتا بلکہ ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے جہاں سب برابر ہوں‘ محبت ہو‘ اتحاد ہو اور کوئی تفریق نہ ہو۔ یہی اسلام کا اصل پیغام ہے۔

شیطان کے خلاف جہاد کا جذبہ

جب شیطان نے حضرت ابراہیم‘ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل ؑ کو ورغلانے کی کوشش کی‘ تو اُنہوں نے اُس پر کنکریاں ماریں۔ آج ایک مسلمان بھی یہی عمل دہرا کر اپنے ایمان کی تازگی کا اعلان کرتا ہے۔ رمی جمار (کنکریاں مارنا) درحقیقت ایک علامتی عمل ہے جو اس عزم کی تجدید کرتا ہے کہ حاجی زندگی بھر شیطان کے وسوسوں اور گناہوں سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ یہ عمل ہمیں یاد دلاتا ہے کہ شیطان ہر دور میں ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے‘ اور ہم اللہ کی رضا کے لیے اُس پر کنکریاں مار کر اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ عمل روح میں تقویٰ اور نیکی کی مضبوطی پیدا کرتا ہے اور شیطان کے خلاف مسلسل جہاد پر آمادہ کرتا ہے۔ حج ہمیں سکھاتا ہے کہ شیطان سے نفرت صرف الفاظ سے نہیں بلکہ عمل سے ہونی چاہیے۔ ہر دن‘ ہر لمحہ ہمیں اپنے نفس اور شیطان کے خلاف جہاد کرنا ہے‘ تاکہ ہم اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔

دنیاوی محبتوں سے بے نیازی

حج عشق و قربانی کا وہ سفر ہے جو انسان کو دنیا کی فانی محبتوں سے نکال کر اللہ کی ابدی محبت سے جوڑ دیتا ہے۔ جب بندہ احرام باندھتا ہے‘ تو وہ نہ صرف ظاہری لباس اتارتا ہے بلکہ دل سے ہر دنیاوی تعلق‘ غرور اور محبت کی چادر بھی اُتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ عرفات کی وادی میں کھڑے ہو کر جب وہ اپنے رب کے حضور ہاتھ اُٹھاتا ہے‘ تو دنیا کی ہر محبت ماند پڑ جاتی ہے۔ وہ صرف اللہ پر بھروسا کرتا ہے اور اُس کی مدد کا طلب گار رہتا ہے۔ یہ تجربہ اُس کے دل میں اللہ کی محبت کو بڑھاتا ہے اور دنیاوی لذتوں اور خواہشات سے بے رغبتی پیدا کرتا ہے۔ دل سے صرف ایک صدا بلند ہوتی ہے: لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْک۔ یہی حج کا حقیقی پیغام ہے‘ دنیاوی محبتوں سے بے نیازی اور رب سے سچی وابستگی!

دعاؤں کی قبولیت اور قربِ الٰہی کا احساس

حج کے دوران خاص طور پر عرفات کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے کا وعدہ فرماتا ہے۔ عرفات کا دن ’’یومِ دعا‘‘ کہلاتا ہے کیونکہ یہ وہ لمحہ ہے جب مسلمان اللہ کے حضور عاجزی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں‘ اور اُن کی دعائیں شرفِ قبولیت پاتی ہیں۔ یہ روحانی تجربہ یہ احساس دلاتا ہے کہ اللہ اُس کے بہت قریب ہے اور وہ اُس کی دعا سن رہا ہے۔ اس احساس سے دل اطمینان اور سکون پاتا ہے۔

نئی زندگی کا آغاز

جب ایک مسلمان حج کے عظیم سفر سے گناہوں سے پاک ہو کر واپس آتا ہے‘ تو اُس کے دل و دماغ میں ایک نئی روشنی‘ ایک نئی امید‘ اور اللہ کے قریب ہونے کا ایک نیا احساس ہوتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب وہ اپنی زندگی کو گناہوں سے پاک کر کے ایک نئی راہ پر ڈالنے کا عزم کرتا ہے اور یہی حج کا سب سے بڑا روحانی ثمر ہے۔

❀❀❀

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

علالت اور عیادت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

انسان پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں۔ ان میں سب سے بڑی نعمت صحت ہے۔ مرزا قربان علی بیگ سالک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ؎

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک　　تندرستی ہزار نعمت ہے!

تندرستی وہ نعمت ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے انسان ہر نعمت کے چھن جانے کو برداشت کر سکتا ہے‘ مگر صحت نہ ہو تو مال و دولت اور دنیا بھر کی سہولتیں اس کے لیے بے کار ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے ہر وقت تندرستی کی دعا ہی کرنی چاہیے۔ تندرست آدمی جہاں معاشی جِدّ و جُہد اور دوسرے ضروری کام کر سکتا ہے وہاں وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی پورے کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے صحت و تندرستی طلب کرنا ایک مسنون عمل ہے جس کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے کئی دعائیں سکھائی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دعا:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَافِیَۃَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ وَاَھْلِیْ وَمَالِیْ)) (سنن ابی داوٗد:۵۰۷۴)

’’اے اللہ! بے شک میں آپ سے دنیا اور آخرت میں عافیت مانگتا ہوں۔ اے اللہ! بے شک میں آپ سے درگزر کا اور عافیت کا سوال کرتا ہوں اپنے دین میں‘ اپنی دنیا میں‘ اپنے اہل خانہ میں اور اپنے مال میں۔‘‘

اس دعا میں جہاں دنیاوی زندگی میں صحت و عافیت کے لیے دعا مانگی گئی ہے وہاں آخرت میں بھی عافیت طلب کی گئی ہے‘ کیونکہ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ بندہ اگلی حقیقی اور نہ ختم ہونے والی زندگی میں عافیت حاصل کر لے۔

صحت و عافیت مانگنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہی دعا سکھائی ہے جو خود شفا دینے والا ہے۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ ﴿۸۰﴾﴾ (الشعراء) ’’اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی (اللہ) مجھے شفا دیتا ہے۔‘‘ جو

شخص کسی مرض میں مبتلا ہوتا ہے وہ ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ بیماری نہ صرف اس کے خیالات بلکہ معمولات کو بھی بری طرح متاثر کرتی ہے جس کی وجہ سے اس کی طبیعت میں اعتدال نہیں رہتا۔ لہٰذا اس کے پاس جانا چاہیے اور اس سے صحت کے معاملے میں پُرامید رہنے کی گفتگو کرنی چاہیے۔ اسی کو عیادت کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ جب کسی مریض کی عیادت کے لیے جاتے تو اس کی شفا کے لیے دعا فرماتے اور کہتے:

((اَذْھِبِ الْبَأسَ رَبَّ النَّاسِ، وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِیْ لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاؤُکَ، شِفَاءً لَّا یُغَادِرُ سَقَمًا))(متفق علیه)

’’اے اللہ! اے لوگوں کے پروردگار! بیماری کو دور کر اور شفا عطا فرما‘ تو ہی شفا عطا فرمانے والا ہے۔ تیری شفا کے بغیر کوئی شفا نہیں‘ ایسی شفا (عطا فرما) جو کسی بیماری کو نہ چھوڑے۔‘‘

رسول اللہ ﷺ بیمار کے پاس بیٹھتے تو اس کے ساتھ حوصلہ افزا باتیں کرتے‘ تندرستی کی امید دلاتے اور فرماتے:

((لَا بَاْسَ طَھُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ)) (رواہ البخاری)

’’کوئی حرج نہیں‘ ان شاء اللہ یہ بیماری (گناہوں سے) پاک کرنے والی ہے۔‘‘

اگر کوئی مریض درد کی شکایت کرتا تو آپ ﷺ اسے درد سے نجات کی امید دلاتے۔ حضرت ابوعبداللہ عثمان بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس درد کی شکایت کی جو اُن کو اپنے جسم میں محسوس ہو رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا: ’’تمہارے جسم میں جس جگہ درد ہے وہاں اپنا ہاتھ رکھو اور تین مرتبہ بسم اللہ کہو‘ پھر سات مرتبہ یہ دعا پڑھو:

((اَعُوْذُ بِعِزَّۃِ اللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ)) (رواہ مسلم)

’’مَیں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کی عزت اور قدرت کے ذریعے سے اس چیز کے شر سے جس کو پاتا ہوں اور جس (کی کثرت) سے ڈرتا ہوں۔‘‘

رسول اللہ ﷺ خود مریض کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔ تسلی اور اُمید کی خوش کن باتیں کر کے مریض کو اطمینان دلاتے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے دعائیہ کلمات اور پُرامید باتیں سن کر مریض راحت محسوس کرتا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میری عیادت کی‘ پھر آپؐ نے دعا فرمائی: ’’اے اللہ! سعد کو شفا عطا فرما۔ اے اللہ! سعد کو شفا عطا فرما۔ اے اللہ! سعد کو شفا عطا فرما۔‘‘ (رواہ مسلم)

مریض کی عیادت کرنا بڑی فضیلت کا باعث ہے۔ اس سے نہ صرف مریض تسلی پاتا ہے بلکہ عیادت کرنے والا بھی بڑا اجر پاتا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ ؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو کسی مسلمان کی صبح کو عیادت کرتا ہے مگر یہ کہ شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے رحمت اور مغفرت کی دعا کرتے ہیں' اور اگر شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح ہونے تک ستر ہزار فرشتے اُس کے لیے دعا کرتے ہیں اور اس کے لیے جنت میں ایک پھلوں کا باغ مقرر کر دیا جاتا ہے۔'' (ترمذی)

حضرت ثوبان ؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ایک مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو وہ برابر جنت کے خرفہ میں رہتا ہے جب تک کہ واپس نہ آئے۔'' دریافت کیا گیا: یارسول اللہ ﷺ! خرفہ جنت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جنت کے پھل۔'' (رواہ مسلم)

جہاں آپ ﷺ نے نیکی کے دوسرے کام بتائے وہاں عیادت کا بھی ذکر فرمایا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((عُودُوا الْمَرِيضَ ، وَأَطْعِمُوا الْجَائِعَ ، وَفُكُّوا الْعَانِيَ)) (صحيح البخاری) ''مریض کی عیادت کرو' بھوکوں کو کھانا کھلاؤ اور قیدیوں کو رہائی دلاؤ۔''

رسول اللہ ﷺ نے ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان بھائی کے پانچ حقوق بیان فرمائے۔ ان میں ایک حق مریض کی عیادت کرنا بھی ہے۔ (متفق علیہ)

عیادت ہر مریض کا حق ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم بھی بیمار ہے تو اس کی بیمار پرسی کرنا سُنّت ہے۔ آپ ﷺ نے منافقوں اور یہودیوں کی بھی بیمار پرسی فرمائی۔ ان کو صحت کی امید دلائی اور حق کو اپنانے کی تلقین کی۔

جس طرح زندگی میں خوشی کے ساتھ غم بھی ہوتے ہیں اسی طرح صحت کے ساتھ بیماری بھی ہے۔ بیماری میں انسان معمول کے کام کاج نہیں کر سکتا بلکہ تکلیف میں ہوتا ہے۔ جو شخص بیمار ہو' وہ اس میں صبر سے کام لے اور اللہ تعالیٰ سے شفا کی دعا کرتا رہے تو اس کے صبر کے نتیجے میں اسے اجرِ عظیم عطا کیا جاتا ہے اور اس کے گناہوں کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی مردِ مؤمن کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے مرض سے یا اس کے علاوہ تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ

دیتا ہے جس طرح خزاں رسیدہ درخت اپنے پتے جھاڑ دیتا ہے۔'' (متفق علیہ) بیماری تکلیف دہ شے ہے لیکن جب اسے گناہوں کو مٹانے والی اور درجات کو بلند کرنے والی سمجھ لیا جائے تو اس کا برداشت کرنا سہل ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی بندۂ مؤمن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا بلند مقام طے ہو جاتا ہے جس کو وہ اپنے عمل سے نہیں پا سکتا' تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی جسمانی یا مالی تکلیف میں یا اولاد کی طرف سے کسی صدمہ اور پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے' پھر اس کو صبر کی توفیق دے دیتا ہے' یہاں تک کہ (ان مصائب و تکالیف اور ان پر صبر کرنے کی وجہ سے) اس بلند مقام پر پہنچا دیتا ہے جو اس کے لیے پہلے سے طے ہو چکا تھا۔'' (مسند احمد' سنن ابی داوٗد)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن جب ان بندوں کو جو دنیا میں مبتلائے مصائب رہے' ان مصائب کے عوض اجر و ثواب دیا جائے گا تو وہ لوگ جو دنیا میں ہمیشہ آرام وچین سے رہے حسرت کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں۔'' (رواہ الترمذی' عن جابر ؓ)

بیماری صرف دکھ اور مصیبت نہیں بلکہ اس میں رحمت کا پہلو بھی ہے۔ اس سے گناہوں کی صفائی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سعادت مند بندوں کو چاہیے کہ مصیبت اور بیماری سے سبق حاصل کریں' اور صحت ملنے پر اپنی اصلاح کی فکر اور کوشش کریں۔

حضرت ابوسعید خدری ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مردِ مؤمن کو جو بھی دکھ' جو بھی بیماری' جو بھی پریشانی' جو بھی رنج و غم اور جو بھی اذیت پہنچتی ہے' یہاں تک کہ کانٹا بھی اگر اس کو لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے ذریعہ اس کے گناہوں کی صفائی کر دیتا ہے۔'' (متفق علیہ)

ہر کام کے کچھ آداب ہوتے ہیں جو اس کام کو نتیجہ خیز بنا دیتے ہیں۔ عیادت کرنے والے کو بھی یہ آداب ملحوظ رکھنے چاہئیں۔ مریض کے آرام کا خیال رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ عیادت کے لیے آنے والے کی آمد مریض کے لیے پریشانی کا باعث بن جائے۔ مریض کو شفا کی امید دلائے اور اس بیماری کو گناہوں کی بخشش کا سبب بتائے۔ صبر کے ساتھ یہ مشکل وقت گزارنے کی تلقین کرے۔ ذِکر الٰہی میں مشغول رہنے کو کہے۔ مریض کے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتوں میں نہ لگے۔ تھوڑی دیر بیٹھے اور جلدی اُٹھ جائے۔

❁❁❁

June 2025
Vol.74
Regd. CPL No.115
No.6
Monthly **Meesaq** Lahore

زیر اہتمام: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))

”تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن مجید پڑھے اور پڑھائے۔“ (حدیث نبوی ﷺ)

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جامعہ کلیۃ القرآن (قرآن کالج) لاہور

وفاق المدارس العربیہ پاکستان سے الحاق شدہ

داخلے جاری ہیں

مڈل پاس طلبہ کے لیے
2 سالہ اولیٰ مع میٹرک

درس نظامی (درجہ اولیٰ تا دورہ حدیث) مع میٹرک،
ایف اے، بی اے، ایم اے اور بی ایس پروگرامز

خصوصیات:

- دینی و عصری علوم کا حسین امتزاج
- تجوید پر خاص توجہ
- بہترین قیام و طعام
- عربی تحریر و تکلم پر خصوصی توجہ
- باصلاحیت، قابل اور محنتی اساتذہ کی نگرانی
- ذہین طلبہ و عمدہ کارکردگی دکھانے والے طلبہ کے لیے وظائف
- تربیتی حوالے سے خصوصی پروگرامز
- دینی ماحول میں اعلیٰ تعلیمی معیار
- رہائشی طلبہ کیلئے فری لانڈری کی سہولت

ضروری کوائف برائے داخلہ:

- اولیٰ و میٹرک کے لیے مڈل پاس سرٹیفکیٹ
- 4 عدد حالیہ تصاویر
- والد کے شناختی کارڈ کی کاپی
- ”ب“ فارم/ شناختی کارڈ کی کاپی
- داخلے کے لیے سرپرست/ والد کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

برائے معلومات:
دفتری اوقات کے دوران: 042-35833637
دفتری اوقات کے بعد: 0302-4471171 / 0301-4882395

191-اے، اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

المعلن: مہتمم: حافظ عاطف وحیدؒ — پرنسپل: مظفر حسین ہاشمیؒ